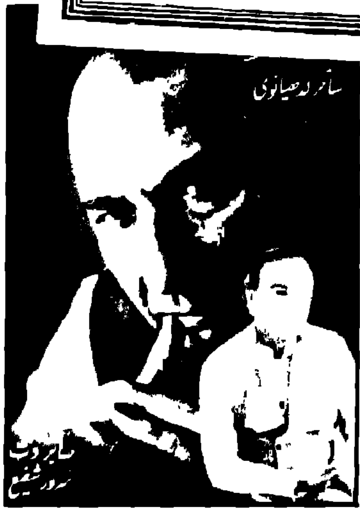
یسی گنیز بک آف ریکارڈز ہوتی جس میں اُردو کے اِس ا









اُردو کی ایک یادگار کتاب

چند تصویرِ بُتاں

(ایک البم)

۱۲۵۳ء — ۱۹۳۰ء

مدیر

صابر دت

سلمیٰ صدّیقی

تھک سپاہی کا



وں میں چھپا لوں گا
زلوں کو سجا لوں گا
شعار کی کلیوں کو
قطعات چرا لوں گا

صابر دت



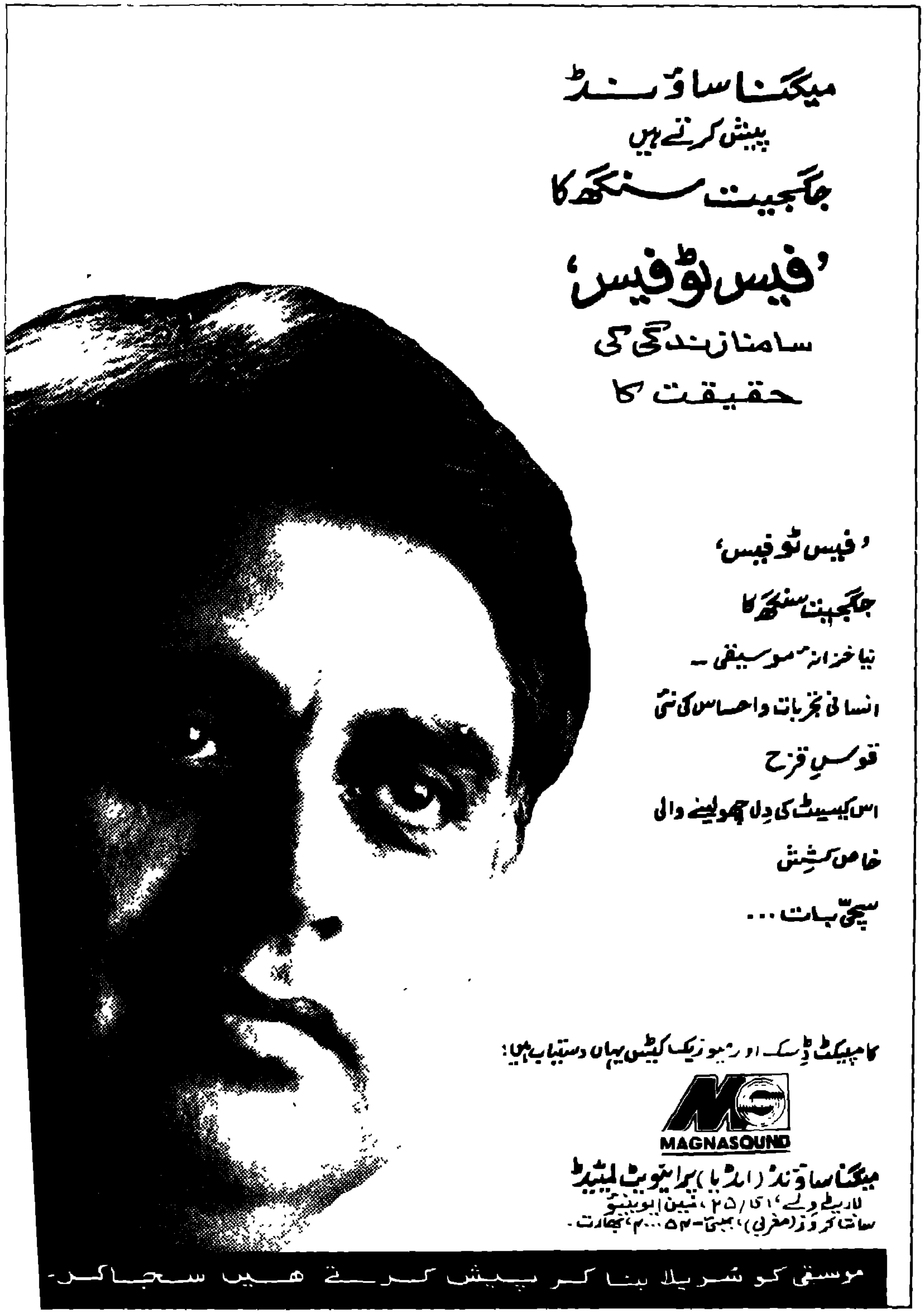


چند کلیاں نشاط کی چن کر
مدّتوں محوِ یاس رہتا ہوں
تیرا ملنا خوشی کی بات سہی
تجھ سے مل کر اداس رہتا ہوں

ساحر لدھیانوی



ساحر پبلشنگ ہاؤس



K SWAMY/BBDO MS 3462 UH

Love........ Beyond Time

NARSIMHA ENTERPRISES

Presents

Surinder Kapoor's

PREM

Produced by	:	**Boney Kapoor**
Directed by	:	**Satish Kaushik**
Written by	:	**Javed Akhtar**
Music	:	**Laxmikant Pyarelal**
Lyrics	:	***Anand Bakshi***

IN ASSOCIATION WITH
ANIL KAPOOR PRODUCTION

With
Best
Compliments
From :

GHAZAL FANS' CLUB

BOMBAY

قطعہ پر تاریخِ ادبِ اُردو میں
پہلی بار ایک مُستند اور جامع دستاویز

قطعہ نمبر

مُدیر

صابر دت

تاریخ ساز رسالہ "فن اور شخصیت" آپ کی خدمت میں شاہکار خصوصی شمارے پیش کرتا ہے۔ یہ جریدہ اصنافِ ادب کے علاوہ ہر اُس شخصیت کے لئے وقف ہے جس نے ادب، فلم، سائنس، سیاست، مصوّری یا زندگی کے کسی بھی اہم شعبہ میں انسانیت کی ترقی کے لئے کوئی کارنامہ انجام دیا ہو ——————

سرپرست

سُنیل دت

• سرِورق —————— گوبند سنگھ • محبوب عالم

• تزئین کار —————— ہرجیت سنگھ سوہی
انور سلیم

• منتظمِ اعلیٰ —————— سرور شفیع

• ناشر —————— انور سلطانہ

فن اور شخصیت

قطعہ نمبر

موجودہ شمارہ

۱۲۵/ روپے

بیرون ہند

۱۲/ امریکی ڈالر

مُدیر

صابر دت

مُعاونین

ظہیر علی

کلیم راہی

ساحر پبلشنگ ہاؤس "پرچھائیاں"

اے۔ بی نائر روڈ، جوہو چرچ، بمبئی نمبر ۴۰۰۰۴۹ فون:- 6202837

شمارہ نمبر ۳۵، ۳۶
مارچ ۱۹۹۳ء اور ستمبر ۱۹۹۳ء

کتابی شکل میں

پاکستان میں جملہ حقوق : حوری نورانی
مکتبہ دانیال، وکٹوریہ چیمبرز،
۲۔ عبداللہ ہارون روڈ، کراچی

اشاعت : مارچ ۱۹۹۵ء
کتابت : محمد سفیان معروفی
طباعت : ماڈرن آرٹ ملٹی کلر پرنٹرس

قطعہ وہ صنف جو کوزے میں سمندر بھر دے
مونالیزا کے تبسّم کی اَدا ہے اِس میں
کبھی فرصت میں ورق آپ اُلٹ کر دیکھیں
آپ کے دِل کے بھی زخموں کا پتا ہے اِس میں

صاؔبر دت

پڑھنے والوں کے نام

’کوالف نمبر‘ کو قارئین نے بے حد سراہا اور اردو ادب کے اہم ناقدین نے اسے تاریخ ساز کارنامہ قرار دیا۔ مجھ جیسے خادمِ اردو کے لئے یہ سب سے بڑا اعزاز ہے۔

ممتاز افسانہ نگار، ناول نگار، ڈرامہ نویس اور شاعر کشمیری لال ذاکر کی پچاس سالہ ادبی خدمات کے اعتراف کے طور پر شائع کیا جانے والا ’کشمیری لال ذاکر نمبر‘ بھی از حد پسند کیا گیا اور ناقدین نے اسے بھی اہم دستاویز قرار دیا۔

اس امر نے میرے حوصلوں کو نیا جوش اور ولولہ عطا کیا ہے اور شاید اسی جذبے کے زیرِ اثر میں آپ کی خدمت میں ’قطعہ نمبر‘ پیش کر رہا ہوں۔ اگر میری اس بات کو خود ستائشی پر محمول نہ کیا جائے تو یہ بھی اپنے آپ میں ایک اہم ادبی کارنامہ ہے کہ اردو ادب کی تاریخ میں آج تک کسی بھی رسالے نے چھ ماہ کے قلیل عرصے میں اس نوعیت اور معیار کے تین تین ضخیم خاص نمبر یکے بعد دیگرے شائع نہیں کئے ہیں۔

اس ضمن میں ایک بات اور کہنا چاہوں گا کہ قطعہ اردو شاعری کی ایک خوبصورت صنفِ سخن ہے لیکن آج تک کسی بھی رسالے نے اس پر جامع اور مکمل خاص نمبر ترتیب نہیں دیا ہے۔ میں بذاتِ خود چونکہ اس صنفِ سخن کا پرستار ہوں لہٰذا فخریہ طور پر یہ خاص نمبر آپ کی نذر کر رہا ہوں۔

صنفِ قطعہ نے ابتدا سے لے کر دورِ حاضر تک [illegible]ت اشکال بدلی ہیں۔ دورِ قدیم میں قطعہ کو قصیدے کا ہی ایک حصّہ تصوّر کیا جاتا تھا اور اسی مناسبت سے اس صنف کو قطعہ کہا گیا۔

قدیم شعراء نے قطعہ پر بہت کم طبع آزمائی کی ہے۔ ولی اور سراج کے کلام میں صرف ایک ایک قطعہ ملتا ہے، خواجہ میر درد اور میر تقی میر کے کلام میں زیادہ تر غزلوں میں قطعہ بند اشعار ملتے ہیں۔ یہی صورتحال اس دور کے دیگر شعراء کے کلام کی ہے۔ البتہ غالب کے کلام میں علیحدہ سے چند قطعات ہیں۔ اکبر الہٰ آبادی کے کلام میں بھی کئی قطعات ملتے ہیں جن کا رنگ طنزیہ اور ظریفانہ ہے اور وہ جدید قطعہ سے مماثلت رکھتے ہیں۔ جیسے اختر الانصاری جدید الاسلوب قطعہ کہتے ہیں۔

قدیم قطعہ تکنیک کے اعتبار سے موجودہ قطعہ سے یکسر مختلف تھا، اور اشعار کی تعداد کا پابند نہیں تھا۔ قدیم شعراء موضوع کے اعتبار سے اشعار کہتے تھے اور اس میں کوئی واقعہ مسلسل بیان کرتے تھے۔ اُن کا

لہجہ حکایتی اور مزاج خطیبانہ ہوتا تھا۔ دکنی سے لے کر اقبال تک یہی روایتی انداز ملتا ہے۔

دورِ قدیم کے شعری سرمائے میں ہمیں قطعۂ تاریخ خاصی تعداد میں ملتے ہیں جو عصری دور میں تقریباً ناپید ہیں۔ قطعۂ تاریخ کسی اہم شخصیت یا کسی عزیز کی رحلت پر قلمبند کئے جاتے تھے جس میں مصرعے یا مصرعے کے ایک حصّہ میں اصولِ ابجد کے مطابق سنِ وفات محفوظ کر لی جاتی تھی۔

دورِ حاضر میں قطعہ صرف دو شعروں پر مشتمل ہوتا ہے اور مطلع کے ہونے یا نہ ہونے کی قید سے آزاد ہے۔ موضوعاتی لحاظ سے ان چار مصرعوں میں شاعر اپنے ایک مجرّد خیال یا احساس کو جامع صورت دیگر بیان کرتا ہے۔ یہ گمان سراسر غلط ہے کہ قطعہ رباعی کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ رباعی اور قطعہ میں نمایاں فرق یہ ہے کہ جدید قطعہ، رباعی کی طرح کسی مخصوص بحر کا پابند نہیں ہے۔ دوسرا فرق یہ ہے کہ رباعی کا سارا نچوڑ اس کے چوتھے مصرعے میں ہوتا ہے جبکہ جدید قطعہ میں چاروں مصرعوں کی اہمیت یکساں ہوتی ہے اور اظہارِ خیال میں ہر مصرع اپنا کردار نبھاتا ہے۔

جدید قطعہ کی ابتدا در حقیقت احسان دانش سے ہوتی ہے۔ اُن کے مجموعۂ کلام 'دردِ زندگی' میں ۳۲ قطعات شامل ہیں۔ اُن کے بعد دیگر ترقی پسند شعراء نے قطعات لکھے۔

قطعہ اُردو ادب کی مستقل صنفِ سخن ہے۔ کئی شعراء نے اس پر بھرپور توجہ دی ہے جن میں اختر انصاری، عبدالحمید عدم، احمد ندیم قاسمی، نریش کمار شاد اور راقم الحروف شامل ہے۔

'قطعہ نمبر' در اصل گنیش بہاری طرز نمبر کے بعد شائع ہونا تھا لیکن ایسا ممکن نہ ہو سکا۔ 'طرز نمبر' کے بارے میں احباب اُردو اور ناقدین نے جو تاثرات ارسال کئے تھے اُن میں سے چند تاثرات میں نے اس شمارے کے آخر میں شامل کر دیئے ہیں۔

میں سردار شفیع، اپنے دوست ظہیر علی، کلیم راہی اور جواں سال آرٹسٹ انور سلیم کا بطورِ خاص شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں جنھوں نے اس خاص نمبر کی تیاری میں مجھ سے بھرپور تعاون کیا۔

اب آپ 'قطعہ نمبر' کا مطالعہ کیجئے اور ہمیشہ کی طرح اپنی قیمتی رائے اور مشوروں سے نوازیئے۔

خاکسار

صابر دت

ترتیب



ولی دکنی

ولی دکنی

آمد : اورنگ آباد سنہ ۱۶۶۷ء

رخصت : احمد آباد ۴ ۱۷۷ء (عام روایت)

۱۷۰۷ء (بہ روایت بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق)

ولی محمد نام، ولی تخلص، اورنگ آباد (دکن) میں پیدا ہوئے۔ اصلی نام کے تعلق سے محققین میں اختلاف ہے۔ انہوں نے ان کے کئی نام کھوج نکالے ہیں جیسے شاہ ولی اللہ، شمس الدین، میاں ولی محمد، محمد ولی اللہ وغیرہ۔ ولی تحصیلِ علوم کے لئے جب احمد آباد گئے تو شاہ وجیہہ الدین کے مدرسے میں داخل ہوئے اور اُن ہی کے مرید ہو گئے۔

ولی اپنے دور کے مقبول شاعر تھے جن کی شہرت دکن کی سنگلاخ چٹانوں کو پار کر کے شمالی ہند کے طول و عرض میں پھیل گئی تھی۔ وہ بھی ایک ایسے دور میں جبکہ نہ تو چھاپے خانے تھے اور نہ تشہیر کے دوسرے وسائل۔

بابائے اُردو ڈاکٹر عبدالحق کے مطابق ولی سنہ ۱۷۰۰ء میں دہلی آئے جہاں شاہ سعد اللہ گلشن نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ دکنی کو ترک کر کے اردوئے معلّٰی میں شاعری کریں۔ لیکن یہ بات درست نہیں ہے چونکہ اُن دنوں سعد اللہ گلشن دکن کی سیاحت پر تھے۔ اکرم قریشی نے اپنی تحقیق میں تاریخی شواہد سے ثابت کیا ہے کہ دہلی میں ولی اور شاہ سعد اللہ گلشن کی ملاقات نہیں ہوئی۔

دوسری روایت ہے کہ ولی سنہ ۱۷۲۰ء میں دوبارہ دہلی آئے۔ یہ بھی درست نہیں چونکہ بابائے اُردو کے مطابق سنہ ۱۷۰۷ء میں اُن کا انتقال ہو چکا تھا۔

ولی کے تیرہ دیوان ہیں۔ اُن کا ایک دیوان سنہ ۱۸۲۳ء میں پیرس سے شائع ہوا تھا۔ ان کے کُلّیات سنہ ۱۹۲۷ء میں ہندوستان میں چھپے۔

ولی اُردو کے پہلے صاحبِ دیوان شاعر نہیں ہیں۔ تاہم اُردو شاعری اور خصوصاً غزل کی حقیقی نشوونما اُن ہی کی ذات سے شروع ہوئی۔ انہوں نے دہلی والوں کو پہلی بار یہ احساس دلایا کہ اُردو میں بھی شاعری ہو سکتی ہے۔ انہوں نے اپنی جان توڑ کوششوں سے غزل کو مقبول ترین صنف بنا دیا۔ ورنہ ان سے قبل مثنوی شعراء کی پسندیدہ صنفِ سخن تھی۔ اِس طرح دہلی والوں نے فارسی سے اُردو کی طرف مراجعت کی۔

ولی کے ابتدائی کلام میں اکثر و بیشتر دکنی الفاظ کا استعمال نظر آتا ہے۔ سفرِ دہلی کے بعد کی شاعری میں زبان نسبتاً صاف اور شستہ ہے۔ بعض اشعار تو موجودہ دور کا کلام جان پڑتے ہیں ؎

راہِ مضمونِ تازہ بند نہیں
تا قیامت کھُلا ہے بابِ سخن

قطعہ در فراق گجرات

گجرات کے فراق سوں ہے خار خار دل ۔۔۔ بے تاب ہے سینے منیں آتش بہار دل
مرہم نہیں ہے اس کے زخم کا جہاں منیں ۔۔۔ شمشیر ہجر سوں جو ہوا ہے فگار دل
اوّل سوں تھا ضعیف پہ پابستہ سوز میں ۔۔۔ جیوں بال ہے اگن کے اُپر بے قرار دل
اس سیر کے نشے سوں ادل تر دماغ تھا ۔۔۔ آخر کوں اس فراق میں کھینچا خمار دل
میرے سینے میں آ کے چمن دیکھ عشق کا ۔۔۔ ہے جوشش خوں سوں تن میں مرے لالہ زار دل
حاصل کیا ہوں جگ میں سراپا شکستگی ۔۔۔ دیکھا ہے مجھ شکست سوں صبح بہار دل
ہجرت سوں دوستاں کے ہوا جی مرا گداز ۔۔۔ عشرت کے پیرہن کوں کیا تار تار دل
ہر آشنا کی یاد کی گرمی سوں تن منیں ۔۔۔ ہر دم میں بے قرار ہے مثل شرار دل
سب عاشقاں حضور اچھے تا کہ سرخ رو ۔۔۔ اپنا اپس لہو سوں کیا ہے فگار دل
حاصل ہوا ہے مجکوں ثمر مجھ شکست سوں ۔۔۔ پایا ہے چاک چاک ہو شکل انار دل
مجمر نمن ہوا ہے بدن سوز ہجر سوں ۔۔۔ اسپند کی مثال ہے آتش سوار دل
افسوس ہے تمام کہ آخر کوں دوستاں ۔۔۔ اُس میکدے سوں اُٹھ کے چلا سدھ لبار دل

لیکن ہزار شکر ولیؔ حق کے فیض سوں
پھر اُس کے دیکھنے کا ہے امیدوار دل



خواجہ میر دردؔ

خواجہ میر درد

آمد : دہلی ۱۷۲۰ء رخصت : دہلی ۱۷۸۵ء

خواجہ میر نام، درد تخلص، دہلی کے ایک معزز نجیب الطرفین حسینی سیّد گھرانے میں پیدا ہوئے۔ درد کے والدِ بزرگوار خواجہ محمد ناصر ایک صوفی منش تھے۔ شاعری سے انہیں بھی لگاؤ تھا۔ شاہ سعد اللہ گلشن اُن کے پیرِ صحبت تھے اور اُن ہی کے تخلص کی مناسبت سے انہوں نے اپنا تخلص عندلیب رکھا تھا۔ اور خواجہ میر نے اپنے والد کے تخلص کی مناسبت سے اپنا تخلص درد رکھا تھا۔

درد نے بائیس برس کی عمر میں اپنے والد کی جگہ سجّادہ نشینی اختیار کی اور دنیاوی زندگی سے تقریباً کنارہ کشی کر کے مذہبی تصنیف و تالیف میں مصروف ہو گئے۔

درد کو عربی، فارسی اور اُردو زبان پر عبور حاصل تھا۔ وہ قرآن، حدیث، فقہ، تفسیر اور علمِ تصوّف پر بھی قدرت رکھتے تھے ـــــ درد کو شاعری کے علاوہ موسیقی سے بھی گہرا لگاؤ تھا حالانکہ اُن کے گھرانے میں سماع منع تھا۔

درد نے ۱۵ سال کی عمر میں اپنی پہلی تصنیف 'اسرار الصّلوٰۃ' فارسی میں لکھی۔ ان کی چھوٹی بڑی تصانیف کی تعداد بارہ ہے۔ جن میں اسرار الصّلوٰۃ کے علاوہ واردات، علم الکتاب، نالۂ درد، آہِ سرد، شمعِ محفل، دردِ دل، حرفِ غنا، واقعاتِ درد، سوزِ دل، دیوانِ فارسی اور دیوانِ اُردو شامل ہیں۔

دیوانِ اردو کے علاوہ ساری تصانیف فارسی ہیں۔

درد مزاجاً قناعت پسند تھے۔ اُن کی شاعری میں تصوّف کا رنگ نمایاں ہے اور ان کے کلام میں خوب جچتا ہے۔ درد چونکہ عملاً صوفی منش تھے اس لئے ان کی شاعری کا متصوفیانہ رنگ فطری ہے۔ رسمی یا جبری نہیں۔ اُن کا کلام ان معنوں میں انفرادی ہے کہ ان کی غزلیں صاف ستھری، سادا، شگفتہ اور مترنّم ہیں۔ ان کی غزلوں میں نا تو مضامین کا تنوّع ہے اور نہ معنی آفرینی کی بلندی۔ اس کے باوجود درد اُردو کے غزل گویوں میں ایک ممتاز درجہ رکھتے ہیں چونکہ اُن کے کلام میں ایک خاص قسم کے کیف اور سرور کی فضا موجود ہے ـــ

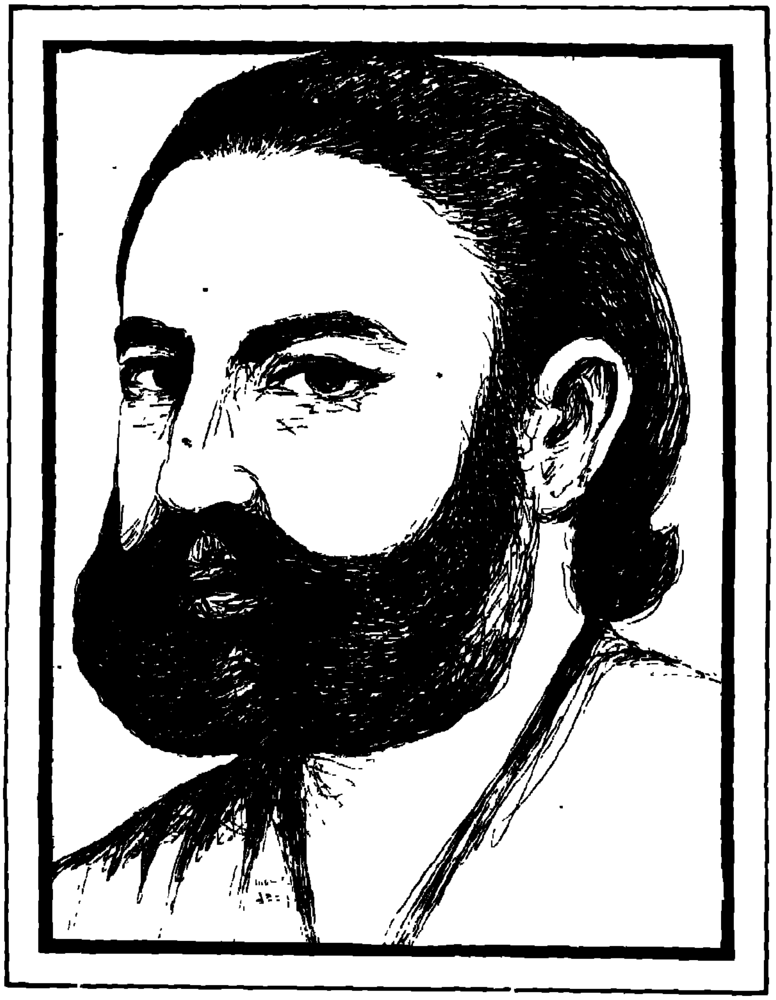
ارض و سماں کہاں تری وسعت کو پا سکے
میرا ہی دل ہے وہ کہ جہاں تو سما سکے

کنج کاوی جو کی سینے میں غمِ ہجراں نے
اُس دفینے ستی اقسام جواھر نکلا
اشکِ تر، لختِ جگر، قطرۂ خوں، پارۂ دل
ایک سے ایک رقم آپ سے بہتر نکلا

ہم یہ کہتے تھے کہ احمق ہو جو دل کو دیوے
دیکھیں تو چھین لے دل ہم سے، وہ کون ایسا ہے
سو اب اک شخص کے ہے زیرِ قدم سر اپنا
سچ کہا ہے کہ بڑے بول کا سر نیچا ہے

نامۂ درد کو مرے لے کر پاس جب یار کے گیا قاصد
پڑھ کے کہنے لگا وہ سرنامہ کون سا یار ہے بتا قاصد
جس نے بھیجا ہے تیرے ہاتھ یہ خط نہیں اس سے آشنا قاصد

دیکھ مجھے طبیب آج، پوچھا جو حالتِ مزاج؛
کہنے لگا کہ لاعلاج، بندہ ہوا میں، خدا نہیں
چہرہ ترا بھی زرد ہے، آہ لبوں پہ سرد ہے
یہ تو میاں وہ درد ہے، جس کی کوئی دوا نہیں



میر تقی میرؔ

میر تقی میر

آمد : اکبر آباد ۱۷۲۲ء رخصت : لکھنؤ ۲۰ ستمبر ۱۸۱۰ء

میر محمد تقی نام، میر تخلص، اکبر آباد (آگرہ) میں پیدا ہوئے۔ جب دس برس کے تھے تو والد کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ سوتیلے بھائیوں نے انہیں اتنی اذیتیں دیں کہ مجبوراً انہیں اکبر آباد چھوڑ کر دہلی جانا پڑا۔ لیکن اسوقت شہر دہلی کی حالت بے انتہا ابتر تھی کیا بادشاہ، کیا گداگر، ہر کوئی تباہ حال و محتاج تھا۔ ایسے پُر آشوب ماحول میں میر نے اپنے سوتیلے ماموں سراج الدین خاں آرزو کے گھر میں پناہ لی لیکن سوتیلے ماموں کا رویہ بھی بیحد ذلت آمیز تھا۔

میر دہلی میں مختلف امراء کی مصاحبت میں رہے۔ احمد شاہ ابدالی کے حملے کے بعد دہلی مکمل طور پر تباہ ہو گئی اور میر کے لئے گزر اوقات کے راستے بالکل بند ہو گئے۔ میر نے دہلی چھوڑ کر لکھنؤ میں نواب آصف الدولہ کے سایۂ عافیت میں پناہ لی۔ نواب نے دو سو روپے ماہوار وظیفہ مقرر کر دیا۔ لکھنؤ ہی میں میر نے ۱۸۱۰ء میں وفات پائی۔

میر انتہائی غیور، تنک مزاج، وضعدار اور خود پسند انسان تھے۔ طبیعتاً غمگین، ملول اور قناعت پسند تھے۔ ان کے کردار کی تمام خصوصیات ان کے کلام میں نمایاں نظر آتی ہیں۔ میر نے کافی لمبی عمر پائی۔ ان کی تصانیف مندرجہ ذیل ہیں۔

فیضِ میر، دریائے عشق، ذکرِ میر اور چھ مکمل دیوان (جو ان کی زندگی میں مرتب ہوتے) اور ایک دیوانچہ، جس میں ان کے دیوان ششم کے بعد سے لے کر وفات تک کا سارا کلام موجود ہے۔

میر نے مختلف اصنافِ سخن پر طبع آزمائی کی۔ لیکن ان کی عظمت اور شہرت کا انحصار اُن کی غزلیات پر ہے۔ اُن کی غزلوں میں سوز و گداز، خستگی، نشتریت، رنگینی، ملاحت اور شوخی کی کیفیات بدرجہ اتم موجود ہیں۔ میر نے اُردو غزل کو ایک عظیم مرتبہ عطا کیا اور وہ آج تک اس صنف کے سب سے بڑے شاعر مانے جاتے ہیں۔ ان کی زبان سادہ اور طرزِ بیان میں اندازِ تخاطب کا رنگ جھلکتا ہے۔ میر کی شاعرانہ عظمت کو نہ صرف اُن کے ہم عصروں نے بلکہ بعد کے ناقدوں نے بھی تسلیم کیا ہے ؎

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
افسوس تم کو میر سے صحبت نہیں رہی

کل پانو ایک کاسۂ سر پر جو آگیا
یک سر وہ استخوان شکستوں سے چور تھا
کہنے لگا کہ دیکھ کے چل راہ بے خبر
میں بھی کبھو کسو کا سرِ پُرغرور تھا

بُلبلیں پائیز میں کہتی تھیں ہوتا کاش کے
یک مژہ رنگِ فراری اس چمن کا آشنا
گو، گل و لالہ کہاں سنبل سمن ہم نسترن
خاک سے یکساں ہوئے ہیں ہائے کیا کیا آشنا
کیا کریں کس سے کہیں اتنا ہی بیگانہ ہے یار
سارے عالم میں نہیں پاتے کسی کا آشنا
جس سے میں چاہی وساطت اُن نے یہ مجھ سے کہا
ہم تو کہتے گر، میاں ہم سے وہ ہوتا آشنا
لوں سُنا جائے کہ کرتا ہے سفر کا عزم جزم
ساتھ اب بیگانہ وضعوں کے ہمارا آشنا
شعر صائبؔ کا مناسب ہے ہماری اور سے
سامنے اُس کے پڑھے گر یہ کوئی جا آشنا

دُنیا کی نہ کر تو خواستگاری
اِس سے کبھو بہرہ ور نہ ہوگا
آ خانہ خرابی اپنی مت کر
قحبہ ہے یہ اس سے گھر نہ ہوگا

حال بد میں میرے بہ تنگ آ کر
آپ کو سب میں نیک نام کیا
ہوگیا دل مرا تبرّک جب
درد نے قطعۂ پیام کیا

بُتاں کے عشق نے بے اختیار کر ڈالا
وہ دل کہ جس کا خدائی میں اختیار رہا
وہ دل کہ شام و سحر جیسے پکا پھوڑا تھا
وہ دل کہ جس سے ہمیشہ جگر فگار رہا

خوب ہے خاک سے بزرگوں کی
چاہنا۔ تو مرے تئیں امداد
پر مروّت کہاں کی ہے اے میر
تو ہی مجھ دِل جلے کو کر اِرشاد

وائے اِس جینے پر اے مستی کہ دورِ چرخ میں
جامِ مے پر گردش آوے اور مے خانہ خراب
چوب حرفی جن الف بے میں نہیں پہچانتا
ہوں میں ابجد خواں شناسائی کو مجھ سے کیا حساب

تاب و طاقت کو تو رخصت ہوئے مدت گزری
پند گو، یوں ہی نہ کر اب خلل اوقات کے بیچ
زندگی کس کے بھروسے پہ محبت میں کروں
ایک دل غم زدہ ہے سو بھی ہے آفات کے بیچ

گر گل ہے گاہ رنگ گہے باغ کی ہے بو
آتا نہیں نظر وہ طرح دار ایک طرح
نیرنگِ حسن دوست سے کر آنکھیں آشنا
ممکن نہیں وگرنہ ہو دیدار ایک طرح

خدا جانے کہ کیا خواہش ہے جی کو
نظر اپنی نہیں ہے مہر و کیں پر
پر افشانی قفس ہی کی بہت ہے
کہ پرواز چمن قابل نہیں پر
جگر میں اپنے باقی روتے روتے
اگرچہ کچھ نہیں اے ہم نشیں پر
کبھو جو آنکھ سے چلتے ہیں آنسو
تو بھر جاتا ہے پانی سب زمیں پر

واں جہاں خاک کے برابر ہے
قدرِ ہفت آسماں ظلم شعار
یہی درخواست پاسِ دل کی ہے
نہیں روزہ نماز کچھ درکار

نہ سمجھا گیا ابر کیا دیکھ کر
ہوا تھا مری چشمِ تر کی طرف
ٹپکتا ہے پلکوں سے خوں متصل
نہیں دیکھتے ہم جگر کی طرف

میر کو ضعف میں میں دیکھ کہا کچھ کہیے
ہے تجھے کوئی گھڑی قوتِ گفتار ہنوز
ابھی اک دم میں زباں چلنے سے رہ جاتی ہے
درد دل کیوں نہیں کرتا ہے تو اظہار ہنوز

ہو عاشقوں میں اُس کے تو آؤ میر صاحب
گردن کو اپنی مو سے باریک تر کرو تم
کیا لطف ہے دگر نہ جس دم وہ تیغ کھینچے
سینہ سپر کریں ہم قطعِ نظر کرو تم

یہی دردِ جدائی ہے جو اس شب
تو آتا ہے جگر مژگانِ تر تک
دکھائی دیں گے ہم میت کے رنگوں
اگر رہ جائیں گے جیتے سحر تک

آنکلے تھے جو حضرت میر اس طرف کہیں
میں نے کیا سوال یہ اُن کی جناب میں
حضرت سنو تو میں بھی تعلق کروں کہیں
فرمانے لاگے رو کے یہ اس کے جواب میں

تڑپھ ہے قیس کے دل میں تہہ زمیں اس سے
غزالِ دشت نشانِ مزار پاتے ہیں
دگر نہ خاک ہوئے کتنے ہی محبت میں
کسی کا بھی کہیں مشتِ غبار پاتے ہیں

نہ آیا وہ تو کیا ہم نیم جاں بھی
بغیر اُس کے ملے دُنیا سے جاویں
چلی ہے تو، تو اے جانِ المناک
ٹک اِک رہ جا کر ہم رخصت ہو آویں

پھر بھی کرتے ہیں میر صاحب عشق
نہیں جواں اختیار رکھتے ہیں
چوٹٹے دل کے ہیں بتاں مشہو
بس یہی اعتبار رکھتے ھیں

کیسے کیسے مکان ہیں ستھرے
اِک اذان جملہ کربلا ہے یاں
اِک سسکتا ہے ایک مرتا ہے
ہر طرف ظلم ہو رہا ہے یاں

کوہ و صحرا بھی کر نہ جائے باش
آج تک کوئی بھی رہا ہے یاں
ہے خبر شرط میر سنتا ہے
تجھ سے آگے یہ کچھ ہوا ہے یاں

قبلہ و کعبہ خداوند و ملاذ و مشفق
مضطرب ہو کے اُسے میں نے لکھا کیا کیا کچھ
پر کہوں کیا رقم شوق کی اپنے تاثیر
ہر سر حرف پہ وہ کہنے لگا کیا کیا کچھ

اِک شخص مجھی سا تھا کہ وہ تجھ پہ تھا عاشق
وہ اس کی وفا پیشگی وہ اُس کی جوانی
یہ کہہ کے جو رویا تو لگا کہنے نہ کہہ میر
سُنتا نہیں میں ظلم رسیدہ دل کی کہانی

ہر چند گدا ہوں میں ترے عشق میں لیکن
ان بوالہوسوں میں کوئی مجھ سا بھی غنی ہے
ہر اشک مرا ہے دُرِ شہوار سے بہتر
ہر لختِ جگر رشکِ عقیقِ یمنی ہے

جاگہ نہیں یاں رو یئے جس پر نہ کھڑے ہو
کچھ شور ہی سر پر تو مجھے یاد کرو گے
اس دشت میں اے راہ رواں ہر قدم اوپر
مانند جرس نالہ و فریاد کرو گے

اب کے ہاتھوں میں شوق کے تیرے
دامنِ بادیہ کا آنچل ہے
ٹک گریباں میں سر کو ڈال کے دیکھ
دل بھی کیا لق و دق جنگل ہے
ہجر باعث ہے بدگمانی کا
غیرتِ عشق ہے تو کب کل ہے
مر گیا کوہ کن اسی غم میں
آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل ہے

نہ جانوں میر کیوں ایسا ہے چپکا
نمونہ ہے یہ آشوب و بلا کا
کرو دن ہی سے رخصت ورنہ شب کو
نہ سونے دے گا شور اس بے نوا کا

پھرتے پھرتے تلاش میں اس کی
ایک میرا ہی یوں نہ جان گیا
اب جو عیسیٰ فلک پہ ہے وہ بھی
شوق میں برسوں خاک چھان گیا

بلبل خموش و لالہ و گُل دونوں سُرخ و زرد
شمشاد محو بے کلی اِک نسترن کے بیچ
کل ہم بھی سیرِ باغ میں تھے ساتھ یار کے
دیکھا تو اور رنگ ہے سارے چمن کے بیچ
یا ساتھ غیر کے ہے تمہیں ویسی بات چیت
سَو سَو طرح کے لطف ہیں اِک اِک سخن کے بیچ
یا پاس میرے لگتی ہے چُپ ایسی آن کر
گویا زباں نہیں ہے تمہاری دہن کے بیچ

دل تنگ اُدھر نہ آیا ایدھر سے کچھ نہ پایا
کہنے کو ترک لے کر اک سوانگ یاں بنایا
دریوزہ کرتے گزری گلیوں میں عمر اپنی
درویش کب ہوئے ہم تکیہ کہاں بنایا

سُنا ہے چاہ کا دعوےٰ تمہارا
کہو جو کچھ کہ چاہو مہرباں ہو
کنارا یوں کیا جاتا نہیں پھر
اگر بائے محبت درمیاں ہو

تسکینِ دل کے واسطے ہر کم بغل کے پاس
انصاف کرے کب تئیں مخلص حقیر ہو
یک وقت خاص حق میں مرے کچھ دعا کرو
تم بھی تو میر صاحب و قبلہ فقیر ہو

کیسو کم ظرف نے لگائی آہ
تجھ سے مے خانے کے جلانے کی
ورنہ اے شیخ شہر واجب تھی
جام واری شراب خانے کی

پھولوں کی سیج پر سے جو بے دماغ اُٹھے
مسند پہ ناز کی جو تیوری چڑھا کے بیٹھے
کیا غم اُسے زمیں پر بے برگ و ساز کوئی
خار و خسک ہی کیوں نہ برسوں بچھا کے بیٹھے

ہے عزم جزم ترک و تجرد کا گر بنے
کیا اس جہانِ سفلہ سے دل کو لگائیے
تاثیر ہے دعا کو فقیروں کی میر جی
ٹک آپ بھی ہمارے لئے ہاتھ اٹھائیے

میں بے نوا اُڑا تھا بوسے کو اُن لبوں کے
ہر دم صدا یہی تھی دے گزرو ٹال کیا ہے
پر چپ ہی لگ گئی جب اُن نے کہا کہ کوئی
پوچھو تو شاہ جی سے اُن کا سوال کیا ہے

گو سرگذشت اُن نے فرہاد کی نکالی
مجنوں کا گا ہے قصہ بیٹھا کہا کرے ہے
ایک آفتِ زماں ہے یہ میرؔ عشق پیشہ
پردے میں سارے مطلب اپنے ادا کرے ہے

ہوا ہے اہلِ مساجد پہ کام ازبس تنگ
نہ شب کو جاگتے رہنے کا اضطراب کرو
خدا کریم ہے اُس کے کرم سے رکھ کر چشم
دراز کھینچو کسو میکدے میں خواب کرو

دُنیا سے درگذر کر گذر گہ عجب ہے یہ
درپیش یعنی میرؔ ہے جانا جہاں سے بھی
لشکر میں ہے منیب اُسی بات کے لئے
کہتے ہیں لوگ کوچ ہے کل صبح یاں سے بھی

مے کشی صبح و شام کرتا ہوں
فاقہ مستی مُدام کرتا ہوں
کوئی ناکام یوں رہے کب تک
میں بھی اب ایک کام کرتا ہوں



نظیر اکبر آبادی

نظیر اکبر آبادی

آمد : دہلی ۱۷۴۰ء رخصت : آگرہ ۱۶ / اگست ۱۸۳۰ء

ولی محمد نام، نظیر تخلص، دہلی میں پیدا ہوئے۔ بچپن ہی میں والد کے سایۂ عافیت سے محروم ہو گئے۔ نظیر کا دور سیاسی انقلابات کا دور تھا۔ مغل حکومت کے بکھرنے کے بعد سماج کا شیرازہ بکھر گیا تھا۔ احمد شاہ ابدالی کے حملے سے دہلی کے حالات مزید ابتر ہو گئے۔ نظیر نے بڑی بے سروسامانی کی حالت میں دہلی کو خیرباد کہا اور آگرہ آ گئے۔ جہاں لالہ بلاس رائے کے لڑکوں کو سترہ روپے ماہوار پر فارسی پڑھانے لگے۔

نظیر ایک وسیع المشرب اور آزادانہ طبیعت رکھتے تھے۔ ایک ایسے دور میں جب شعراء درباروں سے وابستگی کے لئے ہر وقت کوشاں رہا کرتے تھے نظیر نے اپنے خوددار مزاج کو اس آلودگی سے پاک صاف رکھا۔ لکھنؤ سے نواب سعادت علی خاں نے پیغام بھجوایا۔ بھرت پور کے دربار سے بھی دعوت نامہ ملا لیکن نظیر کہیں نہیں گئے اور تمام عمر معلمی کرتے گذار دی۔

نظیر ہندوستانی تہذیب کے دلدادہ تھے اور انہوں نے بڑی بھرپور زندگی بسر کی۔ وہ کھیل کود بازی، تیراکی، ورزش کشتی، کبوتر بازی غرض ہر طرح کے تفریحی مشاغل سے جی بہلاتے تھے اور ہندوستانی تہواروں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ یہ تمام باتیں دراصل ان کی عوامی زندگی سے محبت کی غمازی کرتی ہیں۔

نظیر درحقیقت امیر خسرو اور کبیر کی قائم کردہ اس روایت کی توسیع تھے جس کے رابطے تصوف اور بھکتی تحریک سے ملے ہوئے تھے۔ ان کی شاعری میں ایرانی اثرات بہت کم ملتے ہیں۔ انہوں نے اپنا شعری مزاج ہندوستانی مٹی سے تشکیل دیا تھا۔ انہوں نے غزل کے مقابلے نظم پر زیادہ توجہ دی اور زیادہ تر موضوعات ہندوستانی معاشرے سے ہی منتخب کئے۔ ان کے کلام کا ایک حصہ کرشن جی، مہادیو، بھیروں جی وغیرہ پر لکھی نظموں پر مشتمل ہے۔

نظیر کی زبان سادہ اور عام فہم ہے اور اسی لئے اُن کے کلام کو بے پناہ عوامی مقبولیت حاصل ہوئی۔ انہوں نے شعری صنّاعی پر نہیں بلکہ طرزِ بیان کی سادگی پر زور دیا تھا۔ کلیاتِ نظیر موجود ہے ۔

شہر میں لگتا نہیں صحرا سے گھبراتا ہے دل
اب کہاں لے جا کے بیٹھیں ایسے دیوانے کو ہم

ایک دن اک استخواں اوپر پڑا جو میرا پاؤں
کیا کہوں اُس وقت میرے دل میں کیا کیا دھیان تھے
پاؤں پڑتے ہی غرض اس استخواں نے آہ کی
اور کہا ظالم کبھی ہم بھی تو رکھتے جان تھے
دست و بازو سر و گردن شکم پشت و کمر
دیکھنے کو آنکھیں اور سُننے کی خاطر کان تھے
رات کو سونے کیا کیا نرم و نازک تھے پلنگ
بیٹھنے کو دن کے کیا کیا طاق اور ایوان تھے
لگ رہا تھا دل کہیں چنچل پریزادوں کے ساتھ
کچھ کسی سے عہد تھے اور کچھ کہیں پیمان تھے
گُل بدن اور گُل عذاروں سے کنار و بوس تھا
کچھ اٹھائی تھی ہوس کچھ اور بھی ارمان تھے
ہو رہے تھے قہقہے اور مچ رہے تھے چہچہے
ساقی و ساغر صراحی عطر پھول اور پان تھے
ایک ہی چکر اجل نے آن کر ایسا دیا
پھر نہ ہم تھے اور نہ یہ سب عیش کے سامان تھے
ایسی بے دردی سے ہم پر پاؤں مت رکھ اے نظیر
او میاں ہم بھی کبھی تیری طرح انسان تھے



ابراھیم ذوق

ذوق

آمد: دہلی ۱۷۸۹ء رخصت: دہلی ۱۸۵۴ء

شیخ محمد ابراہیم نام، ذوقؔ تخلص۔ والد کا نام شیخ محمد رمضان، دہلی میں پیدا ہوئے۔ حافظ غلام رسول سے تعلیم حاصل کی۔ وہ شاعر تھے جس کی وجہ سے ذوقؔ بھی شعر کہنے لگے ان دنوں دہلی میں شاہ نصیرؔ کی شاعری کی دھوم تھی۔ ذوقؔ ان سے اصلاح لینے لگے اور جلد ہی مشہور ہو گئے۔ کہا جاتا ہے کہ ذوقؔ کی بڑھتی ہوئی مقبولیت سے گھبرا کر شاہ نصیرؔ نے انہیں اپنے سے دور کر دیا جس کے بعد ذوقؔ نے خود اپنی ریاضت اور قابلیت سے اپنی شعری صلاحیت کا سکہ جمایا۔ اس وقت بہادر شاہ ظفرؔ ولی عہد سلطنت تھے۔ انہوں نے بیس سالہ ذوقؔ کو اپنا استاد مقرر کیا اور انہیں خاقانیٔ ہند کے خطاب سے سرفراز کیا۔ ظفرؔ کی تخت نشینی کے بعد ذوقؔ ملک الشعراء مقرر ہوئے اور تادمِ حیات اس منصب پر فائز رہے۔

ذوقؔ کا کلام زیادہ تر قصائد اور غزلیات پر مشتمل ہے۔ چونکہ ذوقؔ ایامِ جوانی سے وفات تک دربار سے وابستہ رہے۔ ان کے زیادہ تر قصائد بادشاہوں کی مدح سرائی میں ہیں۔ اس صنف پر ذوقؔ کو قدرت حاصل تھی۔ ناقدین انہیں سوداؔ کے بعد سب سے بڑا قصیدہ نگار مانتے ہیں۔

ان کا بیشتر کلام غدر کے ہنگامے کی نذر ہو گیا۔ ان کے شاگرد مولانا محمد حسین آزادؔ نے ان کے دوسرے شاگردوں، حافظ ویرانؔ، انورؔ، ظہیرؔ کی مدد سے ایک مختصر دیوان مرتب کیا جس میں بارہ سو اشعار پر مشتمل غزلیات اور پندرہ قصائد شامل ہیں۔

ذوقؔ کی زبان کی سادگی اور مزاج کی نرمی نے ان کی غزلوں میں برجستگی پیدا کی۔ ذوقؔ بنیادی طور پر مذہبی مزاج رکھتے تھے اور گھنٹوں عبادت میں مشغول رہا کرتے تھے۔ اس کے سبب ان کے کلام میں واعظانہ اور ناصحانہ قسم کے اشعار کی کثرت ہے۔ ذوقؔ کو زبان پر بڑی قدرت حاصل تھی اور یہی خوبی اُن کی شاعری کا طرّہ امتیاز ہے ؎

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

کہوں کیا ذوقؔ احوالِ شبِ ہجر
کہ تھی اک اک گھڑی سو سو مہینے
نہ تھی شب، ڈال رکھا تھا اک اندھیر
مرے بختِ سیہ کی تیرگی نے
کہا جی نے مجھے، یہ ہجر کی رات
یقیں ہے صبح تک دے گی نہ جینے
کہ قسمت سے قریبِ خانہ میرے
اذاں مسجد میں دی بارے کسی نے
مؤذن مرحبا بر وقت بولا!
تری آواز مکے اور مدینے

دنیا سے ذوقؔ رشتۂ اُلفت کو توڑ دے
جس سر کا ہے یہ بال اسی سر میں جوڑ دے
پر ذوقؔ تو نہ چھوڑے گا اس پیر زال کو
یہ پیر زال گر تجھے چاہے تو چھوڑ دے

نذر دیں نفس کُش کو دنیا دار
واہ کیا تیری کار سازی ہے
سچ کہا ہے کسی نے یہ اے ذوقؔ
مالِ موذی نصیبِ غازی ہے

تو بھلا ہے تو بُرا ہو نہیں سکتا اے ذوقؔ
ہے بُرا وہ ہی کہ جو تجھ کو بُرا جانتا ہے
اور اگر تو ہی برا ہے تو وہ سچ کہتا ہے
کیوں بُرا کہنے سے تو اُس کے بُرا مانتا ہے

جن کو اس وقت میں اسلام کا دعویٰ ہے کمال
غور سے دیکھو تو اے ذوقؔ ہے ان کا یہ حال
جس طرح سے کہ ہنسا دینے کو بے دینوں کے
نقل کرتا ہو مسلمان کی کافر نقال



مرزا اسداللہ خاں غالب

غالب

آمد: اکبر آباد (آگرہ) ۲۷ دسمبر ۱۷۹۶ء رخصت: دہلی ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء

اسداللہ خاں نام، مرزا نوشہ لقب، غالب تخلص۔ نجم الدولہ، دبیرالملک، نظام جنگ۔ شاہی خطابات۔ معزز گھرانے میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے فنِ شاعری میں نہ کسی کی شاگردی کی اور نہ کسی رنگ کی پیروی۔ خود اپنا پیرایۂ سخن ایجاد کیا۔ جس نے اُردو کو وقار اور غزل کو اعتبار بخشا۔

غالب کے مزاج میں ظرافت، متانت، اخلاق اور شگفتگی تھی۔ انہوں نے اپنے احباب کے نام جو خطوط لکھے اُن میں ان خصوصیات کی جھلکیاں صاف نظر آتی ہیں۔ غالب کا طرزِ تحریر تا حال اُردو نثر کا بہترین نمونہ ہے۔

غالب کے ابتدائی کلام میں فارسی الفاظ و تراکیب کا استعمال بہت زیادہ نظر آتا ہے۔ لیکن بعد کی غزلوں میں سلاست زبان اور روانی نمایاں ہے۔ در اصل پروازِ تخیل، فکر اور خیالات کی بلندی کے اظہار کے لئے غالب کو فارسی آمیز زبان کی ضرورت تھی۔ اس کی بازگشت ہمیں اقبال کے کلام میں بھی سنائی دیتی ہے۔

غالب کی تصانیف میں، دیوانِ غالب (اردو) سب سے پہلے اکتوبر ۱۸۴۱ء میں چھپا۔ اسکے بعد اُن کی زندگی ہی میں ترمیم و اضافے کے ساتھ اس کے مزید چار ایڈیشن چھپے۔ پانچواں ایڈیشن ۱۸۶۳ء میں آگرہ سے شائع ہوا۔ اس کے علاوہ نسخۂ حمیدیہ، نسخۂ عرشی زادہ، عودِ ہندی اور اردوئے معلّٰی (دو حصّے)، مکاتیب غالب، خطوطِ غالب، نادر خطوطِ غالب، نامۂ غالب، لطائف غیبی، تیغ تیز اور چار فارسی دیوان ہیں۔

غالب بنیادی طور پر غزل گو تھے۔ تاہم انہوں نے قصیدہ، مثنوی، رباعیات، مدح اور قطعہ جیسی اصنافِ سخن کو بھی استعمال کیا۔ اُردو زبان کے اِس سب سے زیادہ قد آور شاعر کے قطعات بھی اپنا ایک الگ رنگ و مقام رکھتے ہیں ؎

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن
خاک ہوجائیں گے ہم، تم کو خبر ہونے تک

اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل
زنہار! اگر تمہیں ہوسِ نائے و نوش ہے
دیکھو مجھے، جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو
میری سنو، جو گوشِ نصیحت نیوش ہے
ساقی، بہ جلوہ، دشمنِ ایمان و آگہی
مطرب، بہ نغمہ، رہزنِ تمکین و ہوش ہے
یا شب کو دیکھتے تھے، کہ ہر گوشۂ بساط
دامانِ باغبان و کفِ گل فروش ہے
لطفِ خرامِ ساقی و ذوقِ صدائے چنگ
یہ جنتِ نگاہ، وہ فردوسِ گوش ہے
یا صبح دم جو دیکھیے آکر، تو بزم میں
نے وہ سرور و شور، نہ جوش و خروش ہے
داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اِک شمع رہ گئی ہے، سو وہ بھی خموش ہے
آتے ہیں غیب سے، یہ مضامیں خیال میں
غالبؔ! صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

کلکتے کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں!
اِک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے
وہ سبزہ زار ہائے مطرّا، کہ ہے غضب
وہ نازنیں بتانِ خود آرا، کہ ہائے ہائے
صبر آزما وہ اُن کی نگاہیں کہ حف نظر
طاقت رُبا وہ اُن کا اشارا، کہ ہائے ہائے
وہ میوہ ہائے تازۂ شیریں کہ واہ واہ
وہ بادہ ہائے نابِ گوارا، کہ ہائے ہائے

اے شہنشاہِ فلک منظرِ بے مثل و نظیر
اے جہاندارِ کرم شیوۂ بے شبہ و عدیل

پانو سے تیرے ملے فرقِ ارادت اورنگ
فرق سے تیرے کرے کسبِ سعادت اکلیل

تیرا اندازِ سخن، شانۂ زلفِ الہام
تیری رفتارِ قلم، جنبشِ بالِ جبریل

تجھ سے عالم پہ کھلا، رابطۂ قربِ کلیم
تجھ سے دنیا میں بچھا، مائدۂ بذلِ خلیل

بہ سخن، اوج دہِ مرتبۂ معنیٰ و لفظ
بہ کرم، داغ نہِ ناصیۂ قلزم و نیل

تا ترے وقت میں ہو عیش و طرب کی توقیر
تا ترے عہد میں ہو رنج و الم کی تقلیل

ماہ نے چھوڑ دیا ثور سے جانا باہر
زہرہ نے ترک کیا، حوت سے کرنا تحویل

تیری دانش، مری اصلاحِ مفاسد کی رہین
تیری بخشش، مری انجاحِ مقاصد کی کفیل

تیرے اقبالِ ترحم، مرے جینے کی نوید
تیرا اندازِ تغافل، مرے مرنے کی دلیل

بختِ ناساز نے چاہا کہ نہ دے مجھ کو اماں
چرخِ کج باز نے چاہا کہ کرے مجھ کو ذلیل

پیچھے ڈالی ہے سرِ رشتۂ اوقات میں گانٹھ
پہلے ٹھونکی ہے بُنِ ناخنِ تدبیر میں کیل

تپشِ دل نہیں بے رابطۂ خوفِ عظیم
کششِ دم نہیں بے ضابطۂ جرِّ ثقیل

دُرِ معنی سے مرا صفحہ لقا کی ڈاڑھی
غمِ گیتی سے مرا سینہ اَمر کی زنبیل

فکر میری، گہر اندوزِ اشاراتِ کثیر
کِلک میری، رقم آموزِ عباراتِ قلیل

میرے ابہام پہ ہوتی ہے تصدق، توضیح
میرے اجمال سے کرتی ہے تراوش تفصیل

نیک ہوتی مری حالت، تو نہ دیتا تکلیف
جمع ہوتی مری خاطر، تو نہ کرتا تعجیل

قبلۂ کون و مکاں! خستہ نوازی میں یہ دیر
کعبۂ امن و اماں! عقدہ کشائی میں یہ ڈھیل

ہند میں اہلِ تسنّن کی ہیں دو سلطنتیں
حیدرآبادِ دکن، رشکِ گلستانِ ارم
رام پور، اہلِ نظر کی ہے نظر میں وہ شہر
کہ جہاں ہشت بہشت آکے ہوئے ہیں باہم
حیدرآباد بہت دور ہے اس ملک کے لوگ
اُس طرف کو نہیں جاتے ہیں، جو جاتے ہیں تو کم
رام پور آج ہے وہ بقعۂ معمور، کہ ہے
مرجع و مجمعِ اشرافِ نژادِ آدم
رام پور، ایک بڑا باغ ہے از روئے مثال
دلکش و تازہ و شاداب و وسیع و خرّم
جس طرح باغ میں ساون کی گھٹائیں برسیں
ہے اُسی طور یہاں دجلہ فشاں دستِ کرم
ابرِ دستِ کرمِ کلبِ علی خاں سے مُدام
دُرِ شہوار ہیں، جو گرتے ہیں قطرے پیہم
صبح دم باغ میں آجائے، جسے ہو نہ یقیں
سبزہ و برگِ گل و لالہ پہ دیکھے شبنم
حبّذا باغِ ہمایونِ تقدّس آثار!
کہ جہاں چرنے کو آتے ہیں غزالانِ حرم

مسلکِ شرع کے ہیں راہ رو و راہ شناس
خضر بھی یہاں اگر آجائے تو لے اُن کے قدم
مدح کے بعد دعا چاہیئے، اور اہلِ سخن
اس کو کرتے ہیں بہت بڑھ کے باغراق رقم
حق سے کیا مانگئے، اُن کے لئے جب ہو موجود
ملک و گنجینہ و خیل و سپہ و کوس و علم
ہم نہ تبلیغ کے مائل، نہ غلو کے قائل
دو دعائیں ہیں، کہ وہ دیتے ہیں نواب کو ہم
یا خدا! غالبِ عاصی کے خداوند کو دے
دو وہ چیزیں، کہ طلب گار ہے جن کا عالَم
اولاً عمرِ طبیعی، بہ دوامِ اقبال
ثانیاً دولتِ دیدارِ شہنشاہِ امم



مومن خاں مومن

مومن

آمد: دہلی ۱۸۰۰ء رخصت: دہلی ۱۴ مئی ۱۸۵۱ء

مومن خاں نام، مومن تخلص، دہلی کے ایک متمول گھرانے میں پیدا ہوئے۔ آبائی پیشہ طبابت تھا۔ آسودہ خاندان کے چشم وچراغ ہونے کی وجہ سے باضابطہ تعلیم حاصل کی۔ مختلف علوم میں مہارت رکھتے تھے۔ ریاضی، نجوم اور موسیقی میں اچھی دستگاہ تھی۔ اپنے خاندانی پیشے کو اختیار کرنے کی غرض سے طب کی باضابطہ تعلیم حاصل کی اور بہت جلد دہلی کے طبیب بن گئے۔

مومن کے لئے شاعری ذریعۂ معاش نہیں تھی۔ وہ کبھی کسی دربار سے وابستہ نہیں رہے اور نہ بادشاہوں کی مدح سرائی میں قصیدے لکھے۔ طبیعت رنگین مزاج تھی اور مالی سہولتیں میسر، اس لئے عیش وعشرت کی زندگی بسر کی۔ اخیر عمر میں مذہبی ہو گئے تھے۔

مومن کا شعری سرمایہ غزلوں، مثنویوں اور قصیدوں پر مشتمل ہے۔ ان کے زیادہ تر قصائد مذہبی شخصیتوں کی مدح میں لکھے گئے ہیں۔ جن سے مومن کی علمی استعداد کا پتہ چلتا ہے۔ ان کی مثنویاں خالص عاشقانہ رنگ لئے ہوتے ہیں جن میں عشق کی داستانیں جذباتی پیرایہ میں بیان کی گئی ہیں۔ بعض جگہ طرزِ بیان عریانی کی حد تک پہنچ گیا ہے۔ اُن کی تصانیف میں اُردو دیوان کے علاوہ فارسی کا ایک دیوان اور فارسی نثر کے چند کتابچے شامل ہیں۔

مومن کی حقیقی شہرت اُن کی غزلوں کی وجہ سے ہے۔ غزلوں میں بھی ان کے موضوعات عشق و محبت تک محدود ہیں۔ تاہم ان کے خیالات کی صداقت اور عشق سے متعلقہ نفسیاتی الجھنوں کے اظہار نے ان کی غزلوں میں ایک منفرد خصوصیت پیدا کر دی ہے جو ان کے معاصرین شعراء کے کلام میں نظر نہیں آتی۔ ان کی زبان کچھ زیادہ ہی مفرّس ہے۔ فارسی ترکیبوں اور صنائع بدائع کا استعمال بھی زیادہ نظر آتا ہے۔ ان کی غزلوں میں فکر کی بلندی نہیں جذبات کی اصلیت ہے۔ اس خصوصیت کی وجہ سے اُن کا کلام ایک خاص دلکشی رکھتا ہے ؎

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دُوسرا نہیں ہوتا

وہ نوجوان عابد و زاہد کہ سب جسے
کہتے تھے مومن اور بہت دیندار تھا

کل ایسے حال سے نظر آیا کہ کیا کہوں
جو تھا سو اُس کو دیکھ کے زار و نزار تھا

بیمار کر دیا شبِ ہجرِ بُتاں نے آہ
کیا ہو گئے وہ روز کہ پرہیزگار تھا

یا تو ہمیں ڈراتے تھے خورشیدِ حسن سے
یا اپنے سر پہ داغِ جنوں شعلہ بار تھا

اختر شماریِ شبِ غم نے بھلا دیا
جتنا خیالِ پرسشِ روزِ شمار تھا

صاحبو میرا حال مت پوچھو
بندہ سخت بے وفا ہوں مَیں

چھوڑ دلی کو سہسوان آیا
ہرزہ گردی میں مبتلا ہوں مَیں

عذر بے جا ہے سرکشی کے لئے
شاکی بے سبب جفا ہوں مَیں

ایک خداوند شوخ کے غم میں
قابلِ رحم ہو گیا ہوں مَیں

مجھے پہنچا دو میرے صاحب تک
کہ غلامِ گریز پا ہوں مَیں

جب کہا میں نے کہ تم بیدادگر، ناآشنا
بے مروّت بے وفا بیگانۂ احباب ہو

ہنس کے فرمایا کہ مَیں تو خیر جو کچھ ہوں سو ہوں
تم بھی تو بے چین ہو بے صبر ہو بیتاب ہو



داغؔ دہلوی

داغؔ دہلوی

آمد: دہلی ۲۵ مئی ۱۸۳۱ء
رخصت: حیدرآباد ۱۶ فروری ۱۹۰۵ء

نواب میرزا خاں نام، داغؔ تخلص، نواب شمس الدین خاں کے فرزند تھے۔ بچپن میں داغؔ کے سر سے والد کا سایہ اٹھ گیا۔ ان کی والدہ نے مرزا مخدوم ولی عہد بہادر شاہ ظفرؔ سے نکاح کر لیا۔ دس گیارہ سال کی عمر سے داغؔ کی تربیت لال قلعہ میں ہوئی وہیں چودہ برس کی عمر میں انہوں نے ذوقؔ کے کم عمر شاگرد کی حیثیت سے پہلا مشاعرہ پڑھا۔ اس عمر کا ایک شعر ؎

رُخِ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں
اُدھر جاتا ہے دیکھیں یا اِدھر آتا ہے پروانہ

اِس شعر پر بہادر شاہ ظفرؔ کے ساتھ غالبؔ جیسے انا پرست سے بھی داد حاصل کی۔ داغؔ کا پہلا مجموعۂ کلام غدر کی تباہی کی نذر ہوا۔ دوسرا دیوان حیدرآباد (دکن) میں کسی شخص نشناس کی نیت کا شکار ہوا۔ اس کے باوجود ان کے چار دیوان، گلزارِ داغؔ، آفتابِ داغؔ، مہتابِ داغؔ اور یادگارِ داغؔ کے علاوہ ایک عشقیہ مثنوی فریادِ داغؔ بھی ان کے شعری فن و کمال کا زندہ ثبوت ہیں۔

داغؔ نے قلعۂ معلّٰی کی بول چال کی زبان کو شعری اعتبار عطا کیا۔ اُن کے شاگردوں کی تعداد دو ہزار بتائی جاتی ہے۔ جن میں ڈاکٹر اقبالؔ، سیمابؔ اکبرآبادی اور جگرؔ مرادآبادی بھی شامل ہیں۔ ان کے کلام میں روانی، سادگی اور وارداتِ قلب و نظر کے ساتھ فلسفۂ حیات بھی موجود ہے۔

ہوش و حواس تاب و تواں داغؔ جا چکے
اب ہم بھی جانے والے ہیں سامان تو گیا

وہ میں کہ میسر تھا مجھے ساغرِ جمشید
پیتا ہوں تو کرتا ہے کمی خونِ جگر آج
وہ میں کہ مرا قصر ہر اک رشکِ ارم تھا
بستر ہے گدایانہ سرِ راہ گذر آج
وہ میں کہ مری عرش پہ تھی منزلِ عالی
کرتی ہے زمیں بھی مرے قدموں سے حذر آج
وہ میں کہ مجھے عالمِ بالا کی خبر تھی
اے بے خبری خاک نہیں اپنی خبر آج
وہ میں کہ مجھے سیرِ گلستاں سے غرض تھی
ہے خونِ جگر اور مرا دیدۂ تر آج
ساماں تھا دنیا کا مرے واسطے موجود
دُنیا سے گذرنے کو نہیں زادِ سفر آج
بازارِ محبت میں لیا غیر نے کیا کیا
ہم کو نہ ملا ایک بھی پتھر کا جگر آج
تھی کل سے تلاش اُن کی مرے قتل پہ اے داغ
نکلے وہ عزادار بنے غیر کے گھر آج

کہیں گے یہی اُس شہِ انبیاء سے
وہاں ہوں گے جب آشکارا محمد
شفیعِ اُمم روزِ محشر تمہیں ہو
ہمیں ہے تمہارا سہارا محمد
صدا خیر مقدم کی کعبہ سے آئی
حرم سے جب آئے دوبارا محمد
بُلا لو مدینہ میں پھر داغ کو تم
نہیں ہند میں اب گذارا محمد

ستم ایجاد کے اندازِ ستم تو دیکھو
امتحاں عشق و ہوس کا یہ نیا رکھا ہے
ہر گھڑی عاشقِ مضطر سے وہ ملتی ہے شبیہ
نقشہ بگڑی ہوئی صورت کا بنا رکھا ہے
شکوۂ ہجر سے اے داغ اثر کی اُمید
آپ نے نام شکایت کا دعا رکھا ہے

قطعہ بطور ہدایت نامہ

اپنے شاگردوں کو یہ عام ہدایت ہے مری — کہ سمجھ لیں تہِ دل سے وہ بجا و بے جا
شعر گوئی میں رہیں مدّ نظر یہ باتیں — کہ بغیر ان کے فصاحت نہیں ہوتی پیدا
چُست بندش ہو نہ ہو سُست یہی خوبی ہے — وہ فصاحت سے گرا شعر میں جو حرف دبا
عربی فارسی الفاظ جو اردو میں کہیں — حرفِ علّت کا بُرا ان میں سے گرنا دبنا
الف وصل اگر آئے تو کچھ عیب نہیں — لیکن الفاظ میں اردو کے یہ گرنا ہے روا
جس میں گنجلک نہ ہو تھوڑی بھی صراحت ہے وہی — وہ کنایہ ہے جو تصریح سے بھی ہو اولیٰ
عیب و خوبی کا سمجھنا ہے اک امرِ نازک — پہلے کچھ اور تھا اب رنگِ زباں اور ہوا
یہی اردو ہے جو پہلے سے چلی آتی ہے — اہلِ دہلی نے اسے اور سے اب اور کیا
مستند اہلِ زباں خاص ہیں دلّی والے — اس میں غیروں کا تصرّف نہیں مانا جاتا
جوہری نقدِ سخن کے ہیں پرکھنے والے — ہے وہ ٹکسال سے باہر جو کسوٹی نہ چڑھا
بعض الفاظ جو دو آئے ہیں اک معنی میں — ایک کو ترک کیا ایک کو قائم رکھا
ترک جو لفظ کیا اب وہ نہیں مستعمل — اگلے لوگوں کی زباں پر وہی دیتا تھا مزا
گرچہ تعقید بُری ہے مگر اچھی ہے کہیں — ہو جو بندش میں مناسب تو نہیں عیب ذرا
شعر میں حشو و زواید بھی بُرے ہوتے ہیں — ایسی بھرتی کو سمجھتے نہیں شاعر اچھا
گر کسی شعر میں ایطائے جلی آتا ہے — وہ بڑا عیب ہے کہتے ہیں اُسے بے معنیٰ
استعارہ جو مزے کا ہو مزے کی تشبیہ — اس میں اک لطف ہے اس کہنے کا پھر کیا کہنا
اصطلاح اچھی مثل اچھی ہو بندش اچھی — روزمرّہ بھی رہے صاف فصاحت سے بھرا
ہے اضافت بھی ضروری مگر ایسی تو نہ ہو — ایک مصرع میں جو ہو چار جگہ بل کہ ہوا

عطف کا بھی ہے یہی حال یہی صورت ہے
وہ بھی آئے متوالی تو نہایت ہے بُرا

لف و نشر آئے مرتب وہ بہت اچھا ہے
اور ہو غیر مرتب تو نہیں کچھ بے جا

شعر میں آئے جو ابہام کسی موقع پر
کیفیت اس میں بھی ہے وہ بھی نہایت اچھا

جو نہ مرغوبِ طبیعت ہو بُری ہے وہ ردیف
شعر بے لطف ہے گر قافیہ ہو بے ڈھنگا

ایک مصرع میں ہو تم دوسرے مصرع میں ہو تو
یہ شتر گربہ ہوا میں نے اسے ترک کیا

چند بحریں متعارف ہیں فقط اُردو میں
فارسی میں عربی میں ہیں مگر ان سے سوا

شعر میں ہوتی ہے شاعر کو ضرورت اِس کی
گر عروض اس نے پڑھا وہ ہے سخنور دانا

مختصر یہ ہے کہ ہوتی ہے طبیعت اُستاد
دین اللہ کی ہے جس کو یہ نعمت ہو عطا

بے اثر کے نہیں ہوتا کبھی مقبول کلام
اور تاثیر وہ شے ہے جسے دیتا ہے خدا

گرچہ دنیا میں ہوئے اور ہیں لاکھوں شاعر
کسبِ فن سے نہیں ہوتی ہے یہ خوبی پیدا

سید احسن جو مرے دوست بھی شاگرد بھی ہیں
جن کو اللہ نے دی فکر رسا طبع رسا

شعر کے حسن و قبائح جو انہوں نے پوچھے
اُن کی درخواست سے اک قطعہ برجستہ کیا

پند نامہ جو کہا داغ نے بے کار نہیں
کام کا قطعہ ہے یہ وقت پہ کام آئے گا

قطعہ تاریخ سالگرہ حضور نظام دکن

اے شاہ دین پناہ ترے عہد میں نہ کیوں
حج و زکوٰۃ و کلمہ و روزہ نماز ہو

شاہا یہ تیری ذات خجستہ صفات ہے
زیبا ہے اہلِ ملک کو جو فخر و ناز ہو

آباد کیوں نہ ملک ہو مخلوق کیوں نہ شاد
جب تجھ سا بادشاہِ رعیت نواز ہو

آصف کے عہد عدل میں ممکن نہیں کبھی
آمادۂ فساد کوئی فتنہ ساز ہو

بد خواہ و نیک خواہ کی حالت یہی رہے
یہ سرنگوں ہمیشہ ہو وہ سرفراز ہو

گزرے تمام عمر نشاط و خوشی کے ساتھ
دل پر ترے ہمیشہ درِ عیش باز ہو

دونوں جہاں میں کام نہیں حسبِ مدعا
ہر دم معین کار ترا کارساز ہو

کیونکر نہ نیک و بد سے زمانے کے ہو خبر
اچھے برے میں جبکہ تجھے امتیاز ہو

لکھی ہے یہ دعائیہ تاریخ داغ نے
سینتیسویں ہے سالگرہ سن دراز ہو

۱۳۲۰ھ

قطعہ در تعریف انبہ دکن

شاہ نے دیں آم بھری کشتیاں
بحرِ عطا کیا ہی ہوا موج زن

کشتیوں میں آم چنے ہیں رنگ رنگ
داغ کا گھر آج ہے رشکِ چمن

سرخ میں ہے لالہ رخوں کی بہار
سبز میں ہے سبز خطوں کی پھبن

زرد میں ہے رنگِ گلِ زعفران
کیسری پوشوں کی ہے اک انجمن

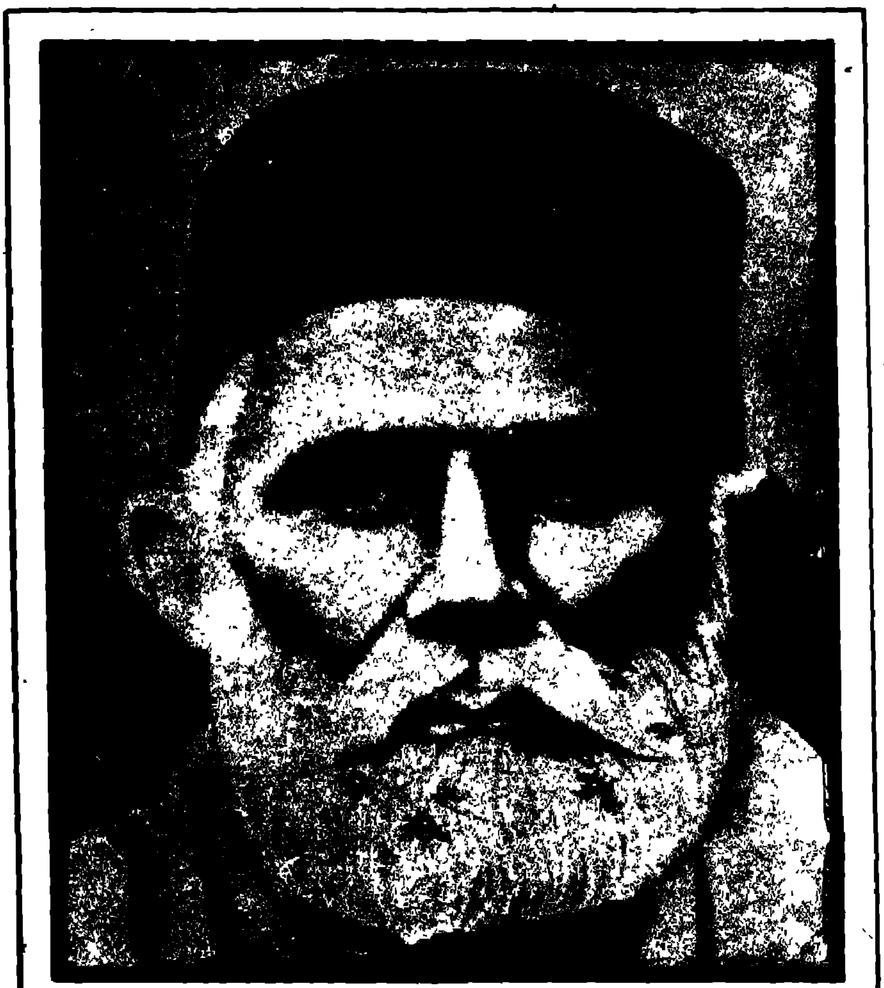
آم سے منھ پر ہے سیاہی کہ ہے
مردمکِ چشم بتِ سیم تن

اُلفتن و مرغوبہ الذّ الثمر
ذائقے میں غیرتِ شہدِ عدن

ایسے کہاں پریوں کے پر سبز سبز
ایسے کہاں حوروں کے سیب ذقن

طوطا پری لال دیا دل پسند
کہتے ہیں نامی انہیں اہلِ دکن

آم ہرا جامِ زمرد کی شکل لال دیا صورتِ لعلِ یمن
سونگھ کے ہو جائے معطر دماغ منھ پر مگر اُن کے ہے مشکِ ختن
رنگ ہے وہ شوخ کہ جیسے پری اور وہ خوشبو کہ معطّر دلہن
گر کبھی ان آموں کا رس چوس لیں ہونٹ ہی چاٹا کریں شیریں دہن
انبہ شیریں جو اُسے ہو نصیب نام بھی شیریں کا نہ لے کوہ کن
جنّتِ دنیا کے یہی تو ہیں آم اِن کا ہی تُصلیح ہے بہشتی لبن
ایسے رسیلے ہیں وہ نازک ہیں پوست جیسے کہ ہوں دل بر نازک بدن
سینکڑوں قسمیں اسی میوے کی ہیں پھر ہے یہ افراط کہ لاکھوں ہی من
واقعی اِن آموں کی تعریف میں کم ہے جہاں تک کہیں اہلِ سخن
قلاش بنے اس کی جو اپنی زباں قند کا کوزہ بنے اپنا دہن
دیکھئے شیرینیِ گفتار پھر نطق بھی چپکے دمِ عرضِ سخن
نام تو ہے گرچہ یہ معنی نہ ہوں شرکتِ اسمی ہے شیریں دہن
مجھ کو یہ مصرع بہت آیا پسند انبتہ اللہ نباتا الحسن
پھولے پھلے شاہ کا باغِ مراد اور ثمریاب ہوں اہلِ زمن
فیض رساں داغؔ کو یارب رہے
خسروِ محبوب نظامِ دکن



الطاف حسین حالی

خواجہ الطاف حسین حالی

آمد: پانی پت ۱۸۳۷ء رخصت: پانی پت ۳۱/دسمبر ۱۹۱۴ء

خواجہ الطاف حسین نام، حالی تخلص۔ انصاریوں کے ایک معزز خاندان میں پیدا ہوئے۔ کم عمری میں والد کا سایہ سر سے اُٹھ گیا اور وہ معاشی مسائل سے تنگ آکر دہلی پہونچے۔

غالب کی شاگردی اختیار کی۔ شیفتہ کی جامع صفات نے حالی کو ذہنی طور پر متاثر کیا۔ شیفتہ کے انتقال کے بعد حالی لاہور چلے گئے اور وہاں چھوٹی موٹی ملازمتیں کرتے رہے۔ لاہور ہی میں انہوں نے انگریزی زبان میں تھوڑی بہت استعداد حاصل کی۔ یہ اردو شاعروں کی تاریخ کا اہم واقعہ ہے۔ حالی شاید اُردو کے پہلے شاعر تھے جو انگریزی سے بھی واقفیت رکھتے تھے۔ اس استعداد نے جہاں اُنھیں نیچرل اور اخلاقی شاعری کی طرف راغب کیا وہیں 'مقدمہ شعرو شاعری' لکھنے پر بھی مجبور کیا۔ سر سیّد نے حالی کی جدّت طرازی کو سراہا اور انھیں کی ایما پر حالی نے اپنا لافانی مسدّس مدوجزر اسلام لکھا۔

حالی کی منظوم تصانیف ہیں، مثنویاں، مسدس حالی، شکوۂ ہند، کلیات حالی، مراثی، مناجاتِ بیوہ، مجموعۂ نظم (اردو)، مجموعۂ نظم (فارسی) اور دو نثری تصانیف میں تریاقِ مسموم، حیاتِ سعدی، مقدمۂ شعرو شاعری، یادگارِ غالب اور حیاتِ جاوید' ہیں۔

حالی ایک قابلِ قدر نقّاد، ایک باعتبار سوانح نگار اور جدید اُردو شاعری کے بانی تھے۔ اُن کی غزلیں اپنی دلکشی، رنگینی اور سلاست کی وجہ سے ایک ممتاز درجہ رکھتی ہیں۔ نیچرل اور اخلاقی شاعری مبالغہ اور صنائع بدائع سے پاک ہے۔ حالی کام کی باتیں نہایت ہی صاف اور سادہ زبان میں لکھنے میں قدرت رکھتے تھے۔ ان کے جذبۂ اصلاح اور پند و نصائح نے بعض جگہ ان کے کلام میں پھیکا پن ضرور پیدا کیا ہے۔ تاہم بحیثیت مجموعی حالی اُردو شاعری کا ایک اہم نام ہیں۔

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں
اب دیکھئے ٹھہرتی ہے جا کر نظر کہاں

نوحۂ دہلی

تذکرہ دہلیٔ مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ
نہ سُنا جائے گا ہم سے یہ فسانا ہرگز

داستاں گُل کی خزاں میں نہ سنانا ہرگز
ہنستے ہنستے ہمیں ظالم نہ رُلانا ہرگز

ڈھونڈھتا ہے دلِ شوریدہ بہانے مطرب
دردانگیز غزل کوئی نہ گانا ہرگز

صحبتیں اگلی مصوّر ہمیں یاد آئیں گی
کوئی دل چسپ مرقّع نہ دکھانا ہرگز

لے کے داغ آئے گا سینہ پہ بہت اے سیّاح
دیکھ اس شہر کے کھنڈروں میں نہ جانا ہرگز

چپّے چپّے پہ ہیں یاں گوہرِ یکتا تہِ خاک
دفن ہوگا کہیں اتنا نہ خزانا ہرگز

رات آخر ہوئی اور بزم ہوئی زیر و زبر
اب نہ دیکھو گے کبھی لطفِ شبانا ہرگز

بزمِ ماتم تو نہیں بزمِ سخن ہے حالیؔ
یاں مناسب نہیں رو رو کے رُلانا ہرگز



اکبر الٰہ آبادی

اکبر الہ آبادی

آمد: موضع باڑہ (الہ آباد) ۱۶ر نومبر ۱۸۴۶ء — رخصت: الہ آباد ۹ر ستمبر ۱۹۲۱ء

سید اکبر حسین نام، اکبر تخلص، الہ آباد کے ایک معزز گھرانے میں پیدا ہوئے۔ سلسلۂ ملازمت نائب تحصیلداری سے شروع کیا اور ترقی کرتے ہوئے جج کے عہدے تک پہنچے۔

برطانوی سامراج نے ہندوستانیوں میں دو قسم کے ردِ عمل پیدا کئے تھے۔ ایک گروہ تو وہ تھا جو مغربی تعلیم و تہذیب سے متاثر ہو کر نئی تعلیم اور نئے اقدار کو اختیار کرنے کی دعوت دیتا تھا۔ سرسید اور حالی اسی گروہ کی نمائندگی کرتے ہیں۔ دوسرا گروہ قدامت پسند تھا جو مشرقی تہذیب و تمدن کو جان سے زیادہ عزیز رکھتا تھا اور مغربی تہذیب کو قوم کے لئے مضر سمجھتا تھا۔ شبلی اور اکبر الہ آبادی اسی گروہ سے تعلق رکھتے ہیں۔

اکبر کی شاعری اپنے دور کی تاریخی حقیقتوں کی عکاسی کرتی ہے۔ اکبر کا دور انتشار اور بحران کا دور تھا۔ مغربی تہذیب ایک طرح سے قدیم ہندوستانی معاشرے کے مذہبی، تہذیبی اور سماجی اقدار کے سامنے بہت بڑا چیلنج تھا۔ اکبر نے مغربی تہذیب کی پیدا کردہ خامیوں پر کڑی نکتہ چینی کی ہے۔ وہ چونکہ بلند پرواز تخیل اور فعال ذہن کے مالک تھے اس لئے انہوں نے شاعری میں طنز کے نشتر استعمال کئے۔ شاعری میں طنز و ظرافت کو معراجِ کمال تک پہنچا دینے کا سہرا اکبر ہی کے سر ہے۔

اکبر گو کہ تنگ نظر اور قدامت پرست تھے تاہم ان کے کلام میں قومی جذبات کی زیریں لہر کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔ دراصل اکبر ہندوستانی قوم کو اخلاقی اور ذہنی پستی کے شکنجے سے آزاد کرانا چاہتے تھے۔

اکبر کا کلام 'کلیاتِ اکبر' کے نام سے تین حصّوں میں شائع ہو چکا ہے۔ اکبر اپنے کلام کی شوخی، ظرافت، طنز اور مضامین کے تنوع کی وجہ سے اُردو شاعری میں ایک منفرد مقام رکھتے ہیں ؎

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام
وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

ختمِ بہار

ختم کیا صبا نے رقص، گُل پہ نثار ہو چکی جوشِ نشاط ہو چکا صورت ہزار ہو چکی

رنگ بنفشہ مٹ، سنبلِ تر نہیں رہا صحنِ چمن میں زینتِ نقش و نگار ہو چکی

رُت وہ جو تھی بدل گئی، آئی بس اور نکل گئی تھی جو ہوا میں نکہت مشک تتار ہو چکی

اب تک اسی روش پہ ہے اکبرِ مست و بے خبر
کہہ دے کوئی عزیز من فصلِ بہار ہو چکی

اِک برگ مضمحل نے یہ اسپیچ میں کہا
موسم کی کچھ خبر نہیں اے ڈالیو تمہیں
اچھا جواب خشک یہ اِک شاخ نے دیا
موسم سے با خبر ہوں تو کیا جڑ کو چھوڑ دیں

ایک طنزیہ وعظ

چاہا جو میں نے ان سے طریقِ عمل پہ وعظ — بولے کہ نظمِ ذیل کو ارقام کیجیے
پیدا ہوئے ہیں ہند میں اس عہد میں جو آپ — خالق کا شکر کیجیے آرام کیجیے
بے انتہا مفید ہیں یہ مغربی علوم — تحصیل ان کی بھی سحر و شام کیجیے
یورپ میں پھریئے پیرس و لندن کو دیکھیے — تحقیق ملک کاشغر و شام کیجیے
ہو جائیے طریقۂ مغرب پہ مطمئن — خاطر سے محو خطرۂ انجام کیجیے
پیرانِ بے فروغ کا گُل ہو چکا چراغ — ناحق نہ دل کو تابع اوہام کیجیے
رکھیے نہ دل کو دیر و کلیسا سے منحرف — متروک قید جامۂ احرام کیجیے
الفاظ کفر و فسق کو بس بھول جائیے — ہر ملّت و طریق کا اکرام کیجیے
رہیے جہاں میں وسعتِ مشرب سے نیک نام — مجھ کو مرید ہندوؤں کو رام کیجیے
رکھیے نمود و شہرت و اعزاز پر نظر — دولت کو صرف کیجیے اور نام کیجیے
سامان جمع کیجیے کوٹھی بنائیے — با صد خلوص دعوتِ حکام کیجیے
آرائشوں سے گھر کو مہذب بنائیے — تزئین طاق و سقف و در و بام کیجیے
یارانِ ہم مذاق سے ہم بزم ہو جیے — موقع ملے تو شغلِ مے و جام کیجیے
مذہب کا نام لیجیے عامل نہ ہو جیے — جو متفق نہ ہو اُسے بدنام کیجیے
طرزِ قدیم پر جو نظر آئیں مولوی — پبلک میں ان کو موردِ الزام کیجیے
زنجیرِ فقہ توڑیئے کہہ کر خلافِ شرع — مضمون لکھیے دعویٰ الہام کیجیے

قومی ترقیوں کے مشاغل بھی ہیں ضرور   اس مد میں بھی ضرور کوئی کام کیجئے
بے رونقی سے کاٹئے کیوں اپنی عمر کو   کیوں انتظار گردشِ ایام کیجئے
جو چاہیئے وہ کیجئے بس یہ ضرور ہے   ہر انجمن میں دعویٰ اسلام کیجئے
لیکن نہ بن پڑیں جو یہ باتیں حضور سے
مُردوں کے ساتھ قبر میں آرام کیجئے

جلوۂ دربار دہلی

سر میں شوق کا سودا دیکھا   دہلی کو ہم نے بھی جا دیکھا
جو کچھ دیکھا اچھا دیکھا   کیا بتلائیں کیا کیا دیکھا
سڑکیں تھیں ہر کمپ سے جاری   پانی تھا ہر پمپ سے جاری
نور کی موجیں لمپ سے جاری   تیزی تھی ہر جمپ سے جاری

نظم ہے مجکو بادہ صافی   شغل یہی ہے دل کو کافی
مانگتا ہوں یاروں سے معافی   خراب دیکھئے لطفِ قوافی
کچھ چہروں پر مردی دیکھی   کچھ چہروں پر زردی دیکھی
اچھی خاصی سردی دیکھی   دل نے جو حالت کر دی دیکھی

جمنا جی کے پاٹ کو دیکھا   اچھے ستھرے گھاٹ کو دیکھا
سب سے اونچے لاٹ کو دیکھا   حضرت ڈیوک کناٹ کو دیکھا
ڈالی میں نارنگی دیکھی   محفل میں سارنگی دیکھی
بے رنگی بارنگی دیکھی   دہر کی رنگا رنگی دیکھی

پلٹن اور رسالے دیکھے   گورے دیکھے کالے دیکھے
سنگینیں اور بھالے دیکھے   بینڈ بجانے والے دیکھے
اچھے اچھوں کو بھٹکا دیکھا   بھیڑ میں کھاتے جھٹکا دیکھا
منھ کو اگرچہ لٹکا دیکھا   دل دربار سے اٹکا دیکھا

خیموں کا اک جنگل دیکھا   اس جنگل میں منگل دیکھا
برہما اور دنگل دیکھا   عزت خواہوں کا دنگل دیکھا
ہاتھی دیکھے بھاری بھرکم   ان کا چلنا کم کم تھم تھم
زرّیں جھولیں نور کا عالم   میلوں تک وہ چم چم چم چم

پُر تھا پہلوئے مسجد جامع　　روشنیاں تھیں ہر سو لامع
کوئی نہیں تھا کسی کا سامع　　سب کے سب تھے دید کے طامع

سُرخی سڑک پر گشتی دیکھی　　سائنس بھی بھیڑ میں گھستی دیکھی
آتشبازی چھٹتی دیکھی　　لطف کی دولت لُٹتی دیکھی

چوکی اک چوکھی دیکھی　　خوب ہی چکھی پکھی دیکھی
ہر سو نعمت رکھی دیکھی　　قہوہ اور دودھ کی لکھی دیکھی

ایک کا حصّہ من و سلوا　　ایک کا حصّہ تھوڑا حلوا
ایک کا حصّہ بھیڑ اور بلوا　　میرا حصّہ دور کا جلوا

اوج برٹش راج کا دیکھا　　پرتو تخت و تاج کا دیکھا
رنگ زمانہ آج کا دیکھا　　رخ کرزن مہراج کا دیکھا

پہونچے پھاند کے سات سمندر　　تخت میں ان کے بیسیوں بندر
حکمت و دانش اُن کے اندر　　اپنی جگہ ہر ایک سکندر

اوج بخت مُلاقی اُن کا　　چرخ ہفت طباقی اُن کا
محفل اُن کی ساقی اُن کا　　آنکھیں میری باقی اُن کا

ہم تو اُن کے خیر طلب ہیں　　ہم کیا ایسے ہی سب کے سب ہیں
اُن کے راج کے عمدہ ڈھب ہیں　　سب سامان عیش و طرب ہیں

اگزبیشن کی شان انوکھی　　ہر شے عمدہ ہر شے چوکھی
اقلیدس کی ناپی جوکھی　　من بھر سونے کی لاگت سوکھی

جشن عظیم اس سال ہوا ہے　　شاہی فورٹ میں بال ہوا ہے
روشن ہر اک ہال ہوا ہے　　قصّہ ماضی حال ہوا ہے

ہے مشہور کوچہ و برزن　　ہال میں ناچیں لیڈی کرزن
طائر ہوش تھے سب کے پرزن　　رشک سے دیکھ رہی تھی ہر زن

ہال میں چمکیں آ کے یکایک　　زرّیں تھی پوشاک جھکا جھک
محو تھا اُن کا اوج سما تک　　چرخ پہ زہرہ اُن کی تھی گاہک

گو رقاصۂ اوج فلک تھی　　اس میں کہاں یہ نوک پلک تھی
اندر کی محفل کی جھلک تھی　　بزم عشرت صبح تلک تھی

کی ہے یہ بندش ذہن رسا نے　　کوئی مانے خواہ نہ مانے
سُنتے ہیں ہم تو یہ افسانے　　جس نے دیکھا ہو وہ جانے

میں نے کہا بہت سی زبانیں ہوں جانتا　　مدت تک امتحان دیئے امتحان پر
جرمن، فرنچ، لیٹن و انگلش پہ ہے عبور　　ثابت مرا کمال ہے سارے جہان پر
اِک شوخ طبع میں نے دکھائی زباں، مجھے　　بجلی تھی ابر میں کہ قمر آسمان پر
بولی رہو گے زیست کی لذت سے بے خبر　　قدرت نہ پائی تم نے اگر اس زبان پر
ہوئی جو مجھ سے یہ فرمائش بُتِ طنّاز　　کہ فنِ شعر میں تو آج ہے بہت ممتاز
لگا دے اس پہ کوئی مصرعہ حسین و نفیس　　زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ بساز
کہا یہ میں نے کہ ہے قید حسن و خوبی کی　　تو سن یہ شعر نشاط آور و نگاہ نواز
پہن لے سایہ مری جان اُتار کر پشواز　　زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ بساز

ایک بوڑھا نحیف و خستہ و زار　　اِک ضرورت سے جاتا تھا بازار
ضعفِ پیری سے خم ہوئی تھی کمر　　راہ بے چارہ چلتا تھا جھک کر
چند لڑکوں کو اُس پہ آئی ہنسی　　قد پہ پھبتی کمان کی سوجھی
کہا اک لڑکے نے پاس سے کر لول　　تو نے کتنے کو لی کمان یہ مول
پیر مرد لطیف و دانش مند　　ہنس کے کہنے لگا کہ اے فرزند
پہونچو گے میری عمر کو جس آن　　مفت مل جائے گی تمہیں یہ کمان



مولانا شبلی نعمانی

شبلی نعمانی

آمد : بندول (اعظم گڑھ) ۱۸۵۷ء   رخصت : اعظم گڑھ ۱۸ / نومبر ۱۹۱۴ء

شبلی نعمانی ایک معزز گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مولوی شکراللہ سے حاصل کی۔ بعد ازاں مشہور عالم مولوی محمد فاروق چریا کوٹی سے عربی زبان، مذہب اور فقہ کی تعلیم لی۔ والد وکیل تھے اس لئے شبلی کو بھی وکالت کی تعلیم دلوائی۔ تاہم وکالت کا پیشہ شبلی کے مزاج کے موافق نہیں تھا۔ اسلئے انہوں نے سرکاری ملازمت کر لی اور امین دیوانی کے عہدے پر فائز ہوئے۔ کچھ عرصہ بعد اس ملازمت سے بھی بیزار ہو گئے اور سر سید کے ایما پر علی گڑھ پہنچے جہاں انہیں فارسی کا پروفیسر مقرر کیا گیا۔ سر سید کی رفاقت شبلی کی زندگی کا اہم ترین واقعہ ہے اس سے ان کے علمی و ادبی شعور کی حدیں بہت وسیع ہوئیں۔

سر سید کے انتقال کے بعد شبلی پروفیسری سے استعفیٰ دے کر اعظم گڑھ چلے آئے اور وہاں ایک نیشنل اسکول کی بنیاد رکھی۔ اب وہ سر سید کے خیالات سے منحرف ہو گئے تھے۔

شبلی کچھ عرصے بعد حیدر آباد پہنچے جہاں اُنہیں محکمۂ تعلیم کا ناظم مقرر کیا گیا۔ قیام حیدر آباد کے دوران شبلی نے کئی اہم کتابیں تصنیف کیں۔ حیدر آباد کی ملازمت کو خیرباد کہہ کر وہ پھر اعظم گڑھ لوٹے اور دارالمصنفین قائم کیا جس کا بنیادی مقصد مصنفین کی حوصلہ افزائی کرنا تھا۔

شبلی ابتدا میں شعر کہتے تھے تاہم بعد میں انہوں نے اپنے آپ کو نثر کے لئے وقف کر دیا۔ ان کا شمار اُردو کے بڑے مصنفین میں ہوتا ہے۔ ان کی تصانیف کی تعداد بھی بہت زیادہ ہے۔ ان کی تصانیف میں المامون، الفاروق، سیرت النبیؐ، علم الکلام، شعرالعجم، سوانح مولانا روم، تاریخ اسلام، فلسفۂ اسلام، حیاتِ خسرو، سفرنامۂ روم، مقالاتِ شبلی، مکاتیبِ شبلی اور دیوانِ شبلی وغیرہ بہت اہم مانی جاتی ہیں۔

شبلی نے ویسے تو مختلف موضوعات پر کتابیں لکھی ہیں۔ لیکن ان کی اہمیت بحیثیت مورخِ اسلام مسلم ہے۔ شاعری کے میدان میں وہ صنفِ قطعہ میں بے حد کامیاب ہوئے۔ ان کے قطعات میں روانی، سادگی، فصاحت و بلاغت جیسی خصوصیات نظر آتی ہیں۔

اب وہی پاؤں ہر اک گام پہ تھرّاتے ہیں
جن کی رفتار سے پامال تھے مرغانِ چمن

عدلِ جہانگیری

قصرِ شاہی میں کہ ممکن نہیں غیروں کا گزر
ایک دن "نورجہاں" بام پہ تھی جلوہ فگن
کوئی شامت زدہ رہ گیر اُدھر آ نکلا
گرچہ تھی قصر میں ہر چار طرف سے قدغن
غیرتِ حسن سے بیگم نے طمنچہ مارا
خاک پر ڈھیر تھا اک کشتۂ بے گور و کفن

ساتھ ہی شاہِ جہاں گیر کو پہونچی جو خبر
غیظ سے آ گئی ابروئے عدالت پہ شکن
حکم بھیجا کہ کنیزانِ شبستانِ شہی
جا کے پوچھ آئیں کہ سچ یا کہ غلط ہے یہ سخن

نخوتِ حُسن سے بیگم نے بصد ناز کہا
میری جانب سے کرو عرض بہ آئینِ حسن
ہاں مجھے واقعۂ قتل سے انکار نہیں
مجھ سے ناموسِ حیا نے یہ کہا تھا کہ "بزن"
اُس کی گستاخ نگاہی نے کیا اسکو ہلاک
کشورِ حُسن میں جاری ہے یہی شرعِ کہن

مفتیِ دیں سے جہانگیر نے فتویٰ پوچھا
کہ شریعت میں کسی کو نہیں کچھ جائے سخن
مفتیِ دیں نے بھی بے خوف و خطر صاف کہا
شرع کہتی ہے کہ قاتل کی اُڑا دو گردن
لوگ دربار میں اس حکم سے تھرا اُٹھے
پر جہاں گیر کے ابرو پہ نہ بل تھا نہ شکن
ترکنوں کو یہ دیا حکم کہ اندر جا کر
پہلے بیگم کو کریں بستۂ زنجیر و رسن
پھر اُسی طرح اسے کھینچ کے باہر لائیں
اور جلاد کو دیں حکم کہ ہاں "تیغ بزن"

یہ وہی نور جہاں ہے کہ حقیقت میں یہی — تھی جہاں گیر کے پردہ میں شہنشاہِ زمن
اُس کی پیشانیٔ نازک پہ جو پڑتی تھی گرہ — جا کے بن جاتی تھی اوراقِ حکومت پہ شکن
اب نہ وہ نور جہاں ہے نہ وہ اندازِ غرور — نہ وہ غمزے ہیں نہ وہ عربدۂ صبر شکن
اب وہی پاؤں ہر اک گام پہ تھرّاتے ہیں — جن کی رفتار سے پامال تھے مرغانِ چمن
ایک مجرم ہے کہ جس کا کوئی حامی نہ شفیع — ایک بیکس ہے کہ جس کا نہ کوئی گھر نہ وطن

خدمتِ شاہ میں بیگم نے یہ بھیجا پیغام — خوں بہا بھی تو شریعت میں ہے اک امرِ حسن
مفتیٔ شرع سے پھر شاہ نے فتویٰ پوچھا — بولے جائز ہے رضامند ہوں گر بچۂ و زن
وارثوں کو جو دیے لاکھ درم بیگم نے — سب نے دربار میں کی عرض کہ اے "شاہِ زمن"
ہم کو مقتول کا لینا نہیں منظور قصاص — قتل کا حکم جو رک جائے تو ہے مستحسن

ہو چکا جب کہ شہنشاہ کو پورا یہ یقیں — کہ نہیں اس میں کوئی شائبۂ حیلہ و فن
اُٹھ کے دربار سے آہستہ چلا سوئے حرم — تھی جہاں نور جہاں معتکف بیت حزن

دفعتاً پاؤں پہ بیگم کے گرا اور یہ کہا
تو اگر کشتہ شدی، آہ چہ می کردم من



علامہ اقبال

اقبال

آمد : سیالکوٹ ۹ نومبر ۱۸۷۷ء رخصت : لاہور ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء

محمد اقبال نام، اقبال تخلص، سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم وہیں حاصل کی پھر لاہور چلے گئے فلسفہ میں ایم اے کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد لندن گئے جہاں بیرسٹری کی تعلیم حاصل کی اور جرمنی سے فلسفہ میں ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری بھی لی۔ لاہور لوٹ کر وکالت شروع کی۔ کچھ عرصے تک کالج کی پروفیسری بھی کی۔ سماجی اور سیاسی مسائل میں دلچسپی بھی لیتے رہے۔ ۱۹۳۱ء میں مسلمانوں کے نمائندے کی حیثیت سے لندن کی گول میز کانفرنس میں بھی شرکت کی۔

اقبال کی اُردو شاعری کو فکری اور موضوعاتی اعتبار سے تین ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اُردو کے روایتی شعراء کی طرح اقبال نے بھی شاعری کی ابتدا غزل سے کی اور داغ سے بذریعہ خط و کتابت اصلاح لیتے رہے۔ لیکن وہ ایک صاحب فکر انسان تھے۔ اُن کی فکری پرواز داغ کی غزل کے محدود دائرے میں مقید نہیں رہ سکتی تھی۔ اُن کی شاعری کا پہلا دور سفر انگلستان ۱۹۰۵ء پر ختم ہوا۔ اس دور میں اُن کا کلام وطنیت اور قومیت کے جذبات کا آئینہ دار ہے۔ دوسرا دور اُن کے قیام انگلستان سے شروع ہوتا ہے۔ اقبال نے یورپ کی سیاست اور مغربی سامراج کی ریشہ دوانیوں کا بغور مطالعہ کیا تھا۔ نتیجتاً انھوں نے وطنیت اور قومیت کو عالمِ انسانیت کے لئے مضر سمجھا اور انسان کی نجات کیلئے اسلامی اخوت، رواداری، خودی اور جذبۂ عمل کی تعلیم دینا شروع کی۔ تیسرے دور میں وہ ایک فلسفی، مفکر اور حکیم کی حیثیت سے سامنے آئے۔

اُن کی کئی اہم تصانیف ہیں جن میں اسرارِ خودی، رموزِ بےخودی، پیامِ مشرق، بانگِ درا، زبورِ عجم، جاوید نامہ، بالِ جبریل، ضربِ کلیم، ارمغانِ حجاز اور فلسفۂ عجم (ترجمہ) وغیرہ شامل ہیں۔

اقبال اُردو کے پہلے فلسفی شاعر ہیں۔ اقبال نے نہ صرف اُردو شاعری کو مغربی مفکروں کے خیالات سے روشناس کیا بلکہ زبان و بیان کی نادر تشبیہوں سے بھی اُردو کی آبیاری کی۔ کبھی کبھی اُن کی زبان ثقیل ہو جاتی ہے۔ تاہم اُنکے مفکرانہ خیالات کے اظہار کیلئے یہ ضروری بھی تھا۔ اُردو شاعری میں میرؔ اور غالبؔ کے بعد اقبال کی اہمیت مسلّم ہے ؎

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

کل ایک شوریدہ خواب گاہ نبیؐ پہ رُو رُو کے کہہ رہا تھا
کہ مصر و ہندوستاں کے مسلم بنائے ملّت مٹا رہے ہیں
یہ زائرانِ حریم مغرب ہزار رہبر بنیں ہمارے
ہمیں بھلا اُن سے واسطہ کیا، جو تجھ سے ناآشنا رہے ہیں
غضب ہیں یہ "مرشدانِ خود بیں" خدا تری قوم کو بچائے
بگاڑ کر تیرے مسلموں کو یہ اپنی عزت بنا رہے ہیں
سُنے گا اقبالؔ کون اُن کو یہ انجمن ہی بدل گئی ہے
نئے زمانے میں آپ ہم کو پرانی باتیں سُنا رہے ہیں

اندازِ بیاں گرچہ بہت شوخ نہیں ہے
شاید کہ اُتر جائے ترے دل میں مری بات
یا وسعتِ افلاک میں تکبیرِ مسلسل
یا خاک کے آغوش میں تسبیح و مناجات
وہ مذہبِ مردانِ خود آگاہ و خدامست
یہ مذہبِ مُلّا و جمادات و نباتات

ہم کو تو میسر نہیں مٹی کا دیا بھی
گھر پیر کا بجلی کے چراغوں سے ہے روشن
شہری ہو دہاتی ہو مسلمان ہے سادہ
مانندِ بتاں پجتے ہیں کعبے کے برہمن

فطرت مری مانندِ نسیمِ سحری ہے
رفتار ہے مری کبھی آہستہ، کبھی تیز
پہناتا ہوں اطلس کی قبا لالہ و گل کو
کرتا ہوں سرِ خار کو سوزن کی طرح تیز

رمز و ایما اس زمانے کے لئے موزوں نہیں
اور آتا بھی نہیں مجھکو سخن سازی کا فن
"قُم بِاِذنِ اللہ" کہہ سکتے تھے جو رخصت ہوئے
خانقاہوں میں مجاور رہ گئے یا گورکن

کل اپنے مریدوں سے کہا پیرِ مغاں نے
قیمت میں یہ معنی ہے دُرِ ناب سے دہ چند
زہراب ہے اس قوم کے حق میں مئے افرنگ
جس قوم کے بچے نہیں خوددار و ہنرمند

نہیں مقام کی خوگر طبیعتِ آزاد
ہوائے سیر مثالِ نسیم پیدا کر
ہزار چشمہ ترے سنگِ راہ سے پھوٹے
خودی میں ڈوب کے ضربِ کلیم پیدا کر

عجب نہیں کہ خدا تک تری رسائی ہو
تری نگہ سے ہے پوشیدہ آدمی کا مقام
تری نماز میں باقی جلال ہے نہ جمال
تری اذاں میں نہیں ہے مری سحر کا پیام

بدل کے بھیس پھر آتے ہیں ہر زمانے میں
اگرچہ پیر ہے آدم جواں ہیں لات و منات
یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدے سے دیتا ہے آدمی کو نجات

مرقد کا شبستاں بھی اُسے راس نہ آیا
آرام قلندر کو تہِ خاک نہیں ہے
خاموشیٔ افلاک تو ہے قبر میں لیکن
بے قیدی و پہنائیٔ افلاک نہیں ہے

آزادیٔ افکار سے ہے اُن کی تباہی
رکھتے نہیں جو فکر و تدبّر کا سلیقہ
ہو فکر اگر خام تو آزادیٔ افکار
انسان کو حیوان بنانے کا طریقہ

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کر دے
کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں
تجھے کتاب سے ممکن نہیں فراغ کہ تو
کتاب خواں ہے مگر صاحبِ کتاب نہیں

فردوس میں رومی سے یہ کہتا تھا سنائی
مشرق میں ابھی تک ہے وہی کاسہ وہی آش
حلّاج کی لیکن یہ روایت ہے کہ آخر
اک مردِ قلندر نے کیا رازِ خودی فاش

مانندِ سحر صحنِ گلستاں میں قدم رکھ
آئے تہِ پا گوہرِ شبنم تو نہ ٹوٹے
ہو کوہ و بیاباں سے ہم آغوش ولیکن
ہاتھوں سے ترے دامنِ افلاک نہ چھوٹے

خودی بلند تھی اس خوں گرفتہ چینی کی
کہا غریب نے جلّاد سے دمِ تعزیر
ٹھہر ٹھہر کہ بہت دلکشا ہے یہ منظر
ذرا میں دیکھ تو لوں تابناکیٔ شمشیر

طریق اہلِ دنیا ہے گلہ شکوہ زمانے کا
نہیں ہے زخم کھا کر آہ کرنا شانِ درویشی
یہ نکتہ پیرِ دانا نے مجھے خلوت میں سمجھایا
کہ ہے ضبطِ فغاں شیری، فغاں روباہی و میشی

وہ کل کے غم و عیش پہ کچھ حق نہیں رکھتا
جو آج خود افروز و جگر سوز نہیں ہے
وہ قوم نہیں لائقِ ہنگامۂ فردا
جس قوم کی تقدیر میں امروز نہیں ہے

اس راز کو اک مردِ فرنگی نے کیا فاش
ہر چند کہ دانا اسے کھولا نہیں کرتے
جمہوریت اِک طرزِ حکومت ہے کہ جس میں
بندوں کو گِنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے

یہ مہر ہے بے مہریٔ صیاد کا پردہ
آئی نہ مرے کام مری تازہ صفیری
رکھنے لگا مرجھائے ہوئے پھول قفس میں
شاید کہ اسیروں کو گوارا ہو اسیری

کہا اقبال نے شیخِ حرم سے
تہِ محرابِ مسجد سو گیا کون ؟
ندا مسجد کی دیواروں سے آئی
فرنگی بُت کدے میں کھو گیا کون؟

تمیزِ خار و گُل سے آشکارا
نسیمِ صبح کی روشن ضمیری
حفاظت پھول کی ممکن نہیں ہے
اگر کانٹے میں ہو خوئے حریری

اقبال نے کل اہلِ خیاباں کو سنایا
یہ شعر نشاط آور و پُر سوز و طربناک
مَیں صورتِ گُل دستِ صبا کا نہیں محتاج
کرتا ہے مرا جوشِ جنوں میری قبا چاک

رہ و رسمِ حرم نامحرمانہ
کلیسا کی ادا سوداگرانہ
تبرّک ہے مرا پیراہنِ چاک
نہیں اہلِ جنوں کا یہ زمانہ

ظلامِ بحر میں کھو کر سنبھل جا
تڑپ جا پیچ کھا کھا کر بدل جا
نہیں ساحل تری قسمت میں اے موج
ابھر کر جس طرف چاہے نکل جا

مکانی ہوں کہ آزادِ مکاں ہوں؟
جہاں میں ہوں کہ خود سارا جہاں ہوں؟
وہ اپنی لامکانی میں رہیں مست
مجھے اتنا بتا دیں میں کہاں ہوں!

پریشاں کاروبارِ آشنائی
پریشاں تر مری رنگیں نوائی
کبھی میں ڈھونڈتا ہوں لذّتِ وصل
خوش آتا ہے کبھی سوزِ جدائی

خودی کی خلوتوں میں گم رہا میں
خدا کے سامنے گویا نہ تھا میں
نہ دیکھا آنکھ اٹھا کر جلوۂ دوست
قیامت میں تماشا بن گیا میں

یقیں مثلِ خلیلؑ آتش نشینی
یقیں اللہ مستی خود گزینی
سن اے تہذیبِ حاضر کے گرفتار
غلامی سے بتر ہے بے یقینی

عرب کے سوز میں سازِ عجم ہے
حرم کا راز توحیدِ اُمم ہے
تہی وحدت سے ہے اندیشۂ غرب
کہ تہذیبِ فرنگی بے حرم ہے

ہر اک ذرہ میں ہے شاید مکیں دل
اسی جلوت میں ہے خلوت نشیں دل
اسیرِ دوش و فردا ہے ولیکن
غلامِ گردشِ دوراں نہیں دل

کوئی دیکھے تو میری نَے نوازی
نفس ہندی، مقامِ نغمہ تازی
نگہ آلودۂ اندازِ افرنگ
طبیعت غزنوی، قسمت ایازی

ترا اندیشہ افلاکی نہیں ہے
تری پرواز لولاکی نہیں ہے
یہ مانا اصل شاہینی ہے تیری
تری آنکھوں میں بیباکی نہیں ہے

نہ مومن ہے نہ مومن کی امیری
رہا صوفی گئی روشن ضمیری
خدا سے پھر وہی قلب و نظر مانگ
نہیں ممکن امیری بے فقیری

نگہ الجھی ہوئی رنگ و بو میں
خرد کھوئی گئی ہے چار سو میں
نہ چھوڑ اے دل فغانِ صبح گاہی
اماں شاید ملے اللہ ھو میں

خودی کی جلوتوں میں مصطفائی
خودی کی خلوتوں میں کبریائی
زمین و آسماں و کرسی و عرش
خودی کی زد میں ہے ساری خدائی

جمالِ عشق و مستی نے نوازی
جلالِ عشق و مستی بے نیازی
کمالِ عشق و مستی ظرفِ حیدرؓ
زوالِ عشق و مستی حرفِ رازی

وہ میرا رونقِ محفل کہاں ہے
مری بجلی مرا حاصل کہاں ہے
مقام اُس کا ہے دل کی خلوتوں میں
خدا جانے مقامِ دل کہاں ہے

ترے سینے میں دَم ہے دل نہیں ہے
ترا دم گرمیٔ محفل نہیں ہے
گزر جا عقل سے آگے کہ یہ نور
چراغِ راہ ہے، منزل نہیں ہے

سوارِ ناقہ و محمل نہیں میں
نشانِ جادہ ہوں منزل نہیں میں
مری تقدیر ہے خاشاک سوزی
فقط بجلی ہوں میں حاصل نہیں میں

ترا جوہر ہے نوری، پاک ہے تُو
فروغِ دیدۂ افلاک ہے تُو
ترے صیدِ زبوں فرشتہ و حُور
کہ شاہینِ شہِ لولاکؐ ہے تو

محبت کا جنوں باقی نہیں ہے
مسلمانوں میں خوں باقی نہیں ہے
صفیں کج، دل پریشاں، سجدہ بے ذوق
کہ جذبِ اندروں باقی نہیں ہے

چمن میں رختِ گُل شبنم سے تر ہے
سمن ہے، سبزہ ہے، بادِ سحر ہے
مگر ہنگامہ ہو سکتا نہیں گرم
یہاں کا لالہ بے سوزِ جگر ہے

خودی کے زور سے دنیا پہ چھا جا
مقامِ رنگ و بو کا راز پا جا
برنگِ بحر ساحل آشنا رہ
کفِ ساحل سے دامن کھینچتا جا

خرد سے راہرو روشن بصر ہے
خرد کیا ہے؟ چراغِ رہ گذر ہے
درونِ خانہ ہنگامے ہیں کیا کیا
چراغِ رہ گذر کو کیا خبر ہے

جوانوں کو مری آہِ سحر دے
پھر ان شاہیں بچوں کو بال و پر دے
خدایا آرزو میری یہی ہے
مرا نورِ بصیرت عام کر دے

کرم تیرا کہ بے جوہر نہیں میں
غلامِ طغرل و سنجر نہیں میں
جہاں بینی مری فطرت ہے لیکن
کسی جمشید کا ساغر نہیں میں

تری دنیا جہانِ مرغ و ماہی
مری دنیا فغانِ صبحگاہی
تری دنیا میں میں محکوم و مجبور
مری دنیا میں تیری پادشاہی

وہی اصلِ مکان و لامکاں ہے
مکاں کیا شے ہے؟ اندازِ بیاں ہے
خضر کیوں کر بتائے کیا بتائے
اگر ماہی کہے دریا کہاں ہے

کبھی آوارہ و بے خانماں عشق
کبھی شاہِ شہاں نوشیرواں عشق
کبھی میداں میں آتا ہے زرہ پوش
کبھی عریاں و بے تیغ و سناں عشق

عطا اسلاف کا جذبِ دروں کر
شریکِ زمرۂ لَا یَحْزَنُوْن کر
خرد کی گتھیاں سلجھا چکا میں
مرے مولا مجھے صاحب جنوں کر

کبھی تنہائیِ کوہ و دمنِ عشق
کبھی سوز و سرور و انجمن عشق
کبھی سرمایۂ محراب و منبر
کبھی مولا علیؓ خیبر شکن عشق

یہ نکتہ میں نے سیکھا بوالحسن سے
کہ جاں مرتی نہیں مرگِ بدن سے
چمک سورج میں کیا باقی رہے گی
اگر بے زار ہو اپنی کرن سے

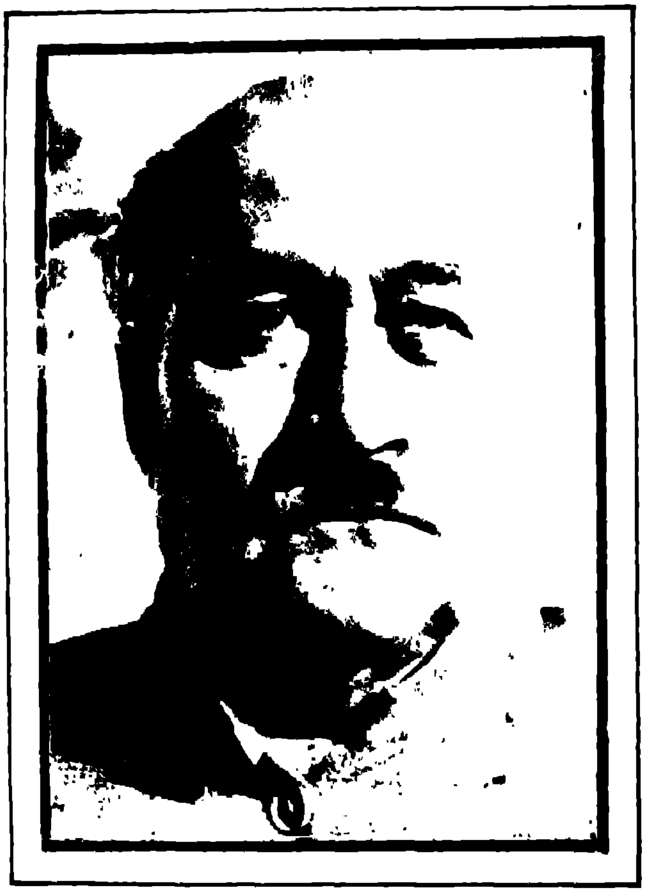
خرد واقف نہیں ہے نیک و بد سے
بڑھی جاتی ہے ظالم اپنی حد سے
خدا جانے مجھے کیا ہو گیا ہے
خرد بیزار دل سے دل خرد سے

یہی آدم ہے سلطاں بحر و بر کا
کہوں کیا ماجرا اس بے بصر کا
نہ خود بیں نے خدا بیں نے جہاں بیں
یہی شہکار ہے تیرے ہنر کا!

خدائی اہتمامِ خشک و تر ہے
خداوندا خدائی دردِ سر ہے
ولیکن بندگی استغفر اللہ
یہ دردِ سر نہیں دردِ جگر ہے

دمِ عارف نسیمِ صبح دم ہے
اِسی سے ریشۂ معنی میں نم ہے
اگر کوئی شعیب آئے میسّر
شبانی سے کلیمی دو قدم ہے

رگوں میں وہ لہو باقی نہیں ہے
وہ دِل، وہ آرزو باقی نہیں ہے
نماز و روزہ و قربانی و حج
یہ سب باقی ہے تو باقی نہیں ہے



جوش ملیح آبادی

جوش ملیح آبادی

آمد : قصبہ کنہار (ملیح آباد) ۲۵/دسمبر ۱۸۹۸ء رخصت : اسلام آباد ۲۲/فروری ۱۹۸۲ء

شبیر حسن خاں نام، جوش تخلص۔ ملیح آباد کے جاگیر دار گھرانے میں پیدا ہوئے۔ اُن کے پر دادا، دادا، اور والد سب صاحبِ دیوان شاعر تھے۔ اس طرح جوش کی تربیت شروع ہی سے علمی اور ادبی ماحول میں ہوئی۔ انہوں نے نو برس کی عمر سے شعر کہنا شروع کئے۔ تعلیم کا سلسلہ پہلے گھر میں ہوا بعد میں لکھنؤ، سیتا پور اور علی گڑھ حصولِ تعلیم کے لئے گئے۔ والد کے انتقال کے بعد زمینداری کے مقدمات اور مالی مشکلات نے آگھیرا تعلیم ادھوری رہ گئی اور ملازمت کے سلسلے میں حیدر آباد پہنچے اور جامعہ عثمانیہ کے دارالترجمہ میں کام کرنے لگے۔ اپنے سیاسی نظریات کے باعث وہاں سے ملک بدر ہوئے۔ دہلی پہنچ کر ایک رسالہ "کلیم" شروع کیا۔ لیکن مالی مشکلات درپیش تھیں اس لئے بمبئی کی راہ لی اور فلموں کے لئے گیت اور کہانیاں لکھنے لگے۔ آزادی کے بعد حکومتِ ہند کے جریدے "آجکل" کے مدیر مقرر ہوئے۔ ۱۹۵۶ء میں پاکستان چلے گئے اور وہیں انتقال کیا

جوش کو ابتدا میں شاعرِ فطرت کہا جاتا تھا۔ پھر وہ شاعرِ شباب کہلانے لگے اور آخر میں وہ شاعرِ انقلاب کی حیثیت سے مشہور ہوئے۔ اس امر سے جوش کے ذہنی ارتقار کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ جوش کو زبان پر بلا کی قدرت حاصل تھی۔ وہ فطری، رومانی اور انقلابی نظمیں لکھنے میں یکساں مہارت رکھتے تھے۔ جوش کے کلام میں شعلوں کی تندی، طوفان کی گھن گرج اور خطابت کی بلند آہنگی ضرور ہے لیکن اُن کی انقلابی نظموں میں تہہ داری، گہرائی اور گیرائی نظر نہیں آتی۔ وہ مزاجاً بہت زیادہ جذباتی تھے اس لئے انھوں نے ہر موضوع کو اپنے جذبات کی آگ دے کر شعلۂ جوّالہ بنا دیا۔

جوش کی تصانیف میں روحِ ادب، نقش و نگار، شعلہ و شبنم، فکر و نشاط، جنون و حکمت، سیف و سبو اور یادوں کی بارات (سوانح عمری) وغیرہ شامل ہیں۔

زبان و بیان پر جوش کی قدرت مسلّم ہے۔ وہ تشبیہات اور استعارات کے استعمال میں ایک منفرد مقام رکھتے ہیں اور اس حیثیت سے وہ اُردو ادب میں ایک بلند مقام کے حقدار ہیں ؎

مانا کہ ہر قدم پہ قیامت ہے پھر بھی جوش
بنتا نہیں کسی سے محبت کئے بغیر

شاعر کا دل

کبھی دل فخر سے دیتا ہے آواز
کہ اک تنکے سے ہلکا آسماں ہے
کبھی فریاد کرتا ہے کہ مجھ پر
نفس کا ثقل بھی کوہِ گراں ہے
کبھی ہر ذرّۂ خاکی کا محکوم
کبھی شمس و قمر پر حکمراں ہے
کبھی ہے کامراں ہوکر بھی ناکام
کبھی ناکام ہوکر کامراں ہے
کبھی لطفِ خداوندی سے مغموم
کبھی جورِ بتاں سے شادماں ہے
کبھی مژگاں کی جنبش سے کہن سال
کبھی صدیوں کی کاوش سے جواں ہے
سُن اے غافل! کہ جس دل کے ہیں یہ طور
وہ دل، ہم شاعروں کا آستاں ہے
دماغوں پر کھلیں ہم کیا کہ ہم کو
وہ سمجھے گا جو دل کا رازداں ہے

مبہم پیام

قلبِ صحرا میں جھٹپٹے کے وقت
دل میں غلطاں ہے ایک طرفہ امنگ
مجھ سے کہتا ہے، کیا، خدا جانے؟
دھان کے کھیت پر شفق کا رنگ

ضبطِ گریہ

گرا نہ آنکھ سے آنسو فریبِ قسمت پر
سکون جس سے ہو وہ اضطراب پیدا کر
مژہ میں روک لے آنسو، کہ دل ہو آئینہ
ستارے توڑ دے اور آفتاب پیدا کر



مخدوم محی الدین

مخدوم محی الدین

آمد: اندول (ضلع میدک) ۴/فروری ۱۹۰۸ء رخصت: دہلی ۲۵/اگست ۱۹۶۹ء

ابوسعید محمد مخدوم الدین خدری، خاندانی نام، مخدوم تخلص۔ ریاست حیدرآباد (دکن) کے ضلع میدک کے تعلقہ اندول میں پیدا ہوئے۔ مولویوں، استادوں، قاریوں، خطاطوں اور مذہب پرستوں کے خاندان کا یہ سپوت اپنے وقت کے اہم ترین مارکسٹوں میں سے ایک تھا۔ مخدوم کی شہرت جتنی اُن کی شاعری کی مرہونِ منت ہے۔ اُن کی اہمیت اس سے کہیں زیادہ اُنکے سیاسی اور سماجی کارناموں میں پوشیدہ ہے۔

ترقی پسند تحریک نے اُردو ادب میں کئی ایسے فنکاروں کو بامِ شہرت پر پہنچایا جو برائے نام مارکسزم یا ترقی پسند طرزِ زندگی پر ایقان رکھتے تھے۔ ان میں سے بیشتر کا رہن سہن روایتی ماحول، تعیش پسندی یا مارکسزم کی اصطلاح میں بورژوائی طرزِ حیات کا آئینہ دار تھا۔ اُردو کے ترقی پسند فنکاروں میں مخدوم ہی وہ واحد فرد تھا جس کے قول و فعل میں تفاوت نظر نہیں آتا۔ اس نے مارکسزم کو مشعلِ راہ بنایا تھا اور تاحیات اسی مشعل کی روشنی سے اکتساب کرتا رہا۔

مخدوم کی شاعرانہ عظمت اُن کی نظموں سے ہے۔ لیکن انہوں نے غزل گوئی میں بھی اپنی تخلیقی صلاحیت کا جادو جگایا ہے۔ مخدوم گو کہ نظریاتی طور پر ایک کٹر مارکسٹ تھے۔ لیکن اُن کی ذات میں چھپے ہوئے فنکار نے اُن کے عقیدے کو فن پر غالب آنے نہیں دیا۔ کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا نے اُن کی یاد میں حیدرآباد میں مخدوم بھون تعمیر کروایا ہے۔ اُن کی تصانیف میں ہوش کے ناخن (برنارڈ شاہ کے ڈرامے کا ترجمہ) ٹیگور اور اس کی شاعری، سُرخ سویرا (شعری مجموعہ)، گلِ تر (شعری مجموعہ) اور بساطِ رقص (کلیات) شامل ہیں۔

مخدوم نے اپنی شعری تخلیقات میں ہمیشہ نعرہ بازی سے دامن بچائے رکھا۔ اسی بات نے انھیں ایک بلند قامت شاعر ثابت کیا ؎

آپ کا ساتھ، ساتھ پھولوں کا
آپ کی بات، بات پھولوں کی

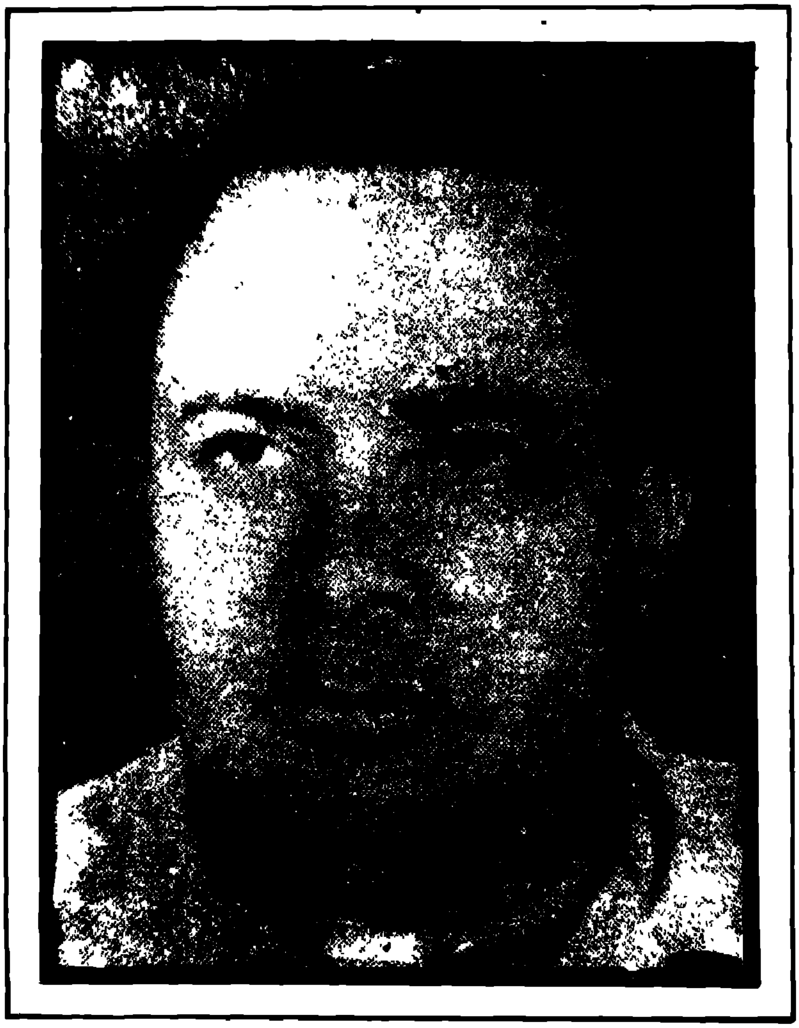
گریباں چاک محفل سے نکل جاؤں تو کیا ہوگا
تری آنکھوں سے آنسو بن کے ڈھل جاؤں تو کیا ہوگا
جنوں کی لغزشیں خود پردہ دارِ رازِ الفت ہیں
جو کہتے ہو سنبھل جاؤ، سنبھل جاؤں تو کیا ہوگا

تو نے کس دل کو دکھایا ہے۔ تجھے کیا معلوم
کس صنم خانے کو ڈھایا ہے تجھے کیا معلوم
ہم نے ہنس ہنس کے تری بزم میں اے پیکرِ ناز
کتنی آہوں کو چھپایا ہے تجھے کیا معلوم

اُسی ادا سے اُسی بانکپن کے ساتھ آؤ
پھر ایک بار اُسی انجمن کے ساتھ آؤ
ہم اپنے ایک دلِ بے خطا کے ساتھ آئیں
تم اپنے محشرِ دار و رسن کے ساتھ آؤ

یہ رقص، رقصِ شرر ہی سہی مگر اے دوست
دلوں کے ساز پہ رقصِ شرر غنیمت ہے
قریب آؤ ذرا اور بھی قریب آؤ!
کہ روح کا سفرِ مختصر غنیمت ہے

ابھی نہ رات کے گیسو کھلے، نہ دل مہکا
کہو نسیمِ سحر سے، ٹھہر ٹھہر کے چلے
ملے تو بچھڑے ہوئے میکدے کے در پہ ملے
نہ آج چاند ہی ڈوبے، نہ آج رات ڈھلے



عبدالحمید عدمؔ

عبدالحمید عدمؔ

آمد : تلونڈی، موسیٰ خان۔جون ۱۹۰۹ء رخصت : لاہور ۱۹۶۸ء

عبدالحمید نام، عدمؔ تخلص۔تلونڈی، موسیٰ خان (صوبہ سرحد۔پاکستان) میں پیدا ہوئے۔ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں میں اور بی اے کی تعلیم لاہور میں حاصل کی۔بڑے ذہین طالب علم تھے اور تمام امتحانات امتیازی نمبرات سے پاس کئے۔سرکاری ملازمت کرلی اور اچھے عہدوں پر فائز رہے۔

عدمؔ کی زیادہ تر شاعری کا محور شراب خانہ ہے۔وہ بلا نوش تھے اور جس رفتار سے پیتے تھے اُسی رفتار سے شعر کہتے تھے۔عدمؔ نے اپنے کلام کا اچھا خاصا ذخیرہ چھوڑا ہے جو غزلوں، نظموں، قطعات اور رباعیات پر مشتمل ہے۔عدمؔ کی چھوٹی بحور کی غزلیں، اُردو شاعری کا قابلِ قدر سرمایہ سمجھی جاتی ہیں۔عدمؔ اپنے مزاج کی نرمی اور اپنی طبیعت کے لااُبالی پن کے اسیر تھے۔اُن کی شعری صلاحیت اکتسابی علم کی نہیں بلکہ اُن کے اپنے تجربات اور احساسات کی مرہونِ منت تھی۔اُن کی شاعری خود اُن کی طرزِ زندگی کی آئینہ دار ہے۔وہ گردشِ دوراں اور غمِ روزگار سے دامن چھڑا کر میخانہ کے مست الست ماحول میں سکون کے متلاشی تھے۔میکدہ نہ صرف عدمؔ کی شاعری بلکہ اُن کی زندگی کا بھی غالب عنصر تھا۔اِس وجہ سے ان کے کلام میں یک رنگی نظر آتی ہے اور فکری بلندی یا تہہ داری کی کمی کا احساس ہوتا ہے لیکن زبان و بیان کی سادگی اور لہجہ کی شوخی کی وجہ سے ان کے کلام میں کافی کشش پیدا ہوگئی ہے۔عدمؔ بہت زود گو شاعر تھے اُن کے کلام کے ۲۴ سے زائد مجموعے موجود ہیں۔جن میں نقشِ دوام، خرابات، دو جام (رباعیات)، شہرِ خوباں (قطعات)، صنم کدہ، زلفِ پریشاں، رَمِ آہو، نگارخانہ، جنسِ گراں، پیچ و خم وغیرہ شامل ہیں۔اگر اُن کی شاعری کا چھان پھٹک کر انتخاب کیا جائے تو عدمؔ کا شمار بلاشبہ اُردو کے اہم شعراء میں ہوگا ؎

میں میکدہ کی راہ سے ہو کر گزر گیا
ورنہ سفر حیات کا کافی طویل تھا

شکن نہ ڈال جبیں پر شراب دیتے ہوئے
یہ مسکراتی ہوئی چیز مسکرا کے پلا
سرور چیز کی مقدار پر نہیں موقوف
شراب کم ہے تو ساقی نظر ملا کے پلا

کون ہے جس نے مے نہیں چکھی
کون جھوٹی قسم اٹھاتا ہے
میکدے سے جو بچ نکلتا ہے
تیری آنکھوں میں ڈوب جاتا ہے

عروسِ صبح نے لی ہے مچل کے انگڑائی
صبا کی نرمیِ رفتار ہے سرور انگیز
یہ وقت ہے کہ عبادت کا اہتمام کریں
خلوصِ دل سے اچھال ایک ساغرِ لبریز

شام ہے اور پار ندی کے
ایک ننھا سا بے قرار دیا
یوں اندھیرے میں ٹمٹماتا ہے
جیسے کشتی کے ڈوبنے کی صدا

وصل کی شب ہے اور سینے میں
ایک مدہوش آگ کا رس ہے
آج سارے چراغ گل کر دو
آج اندھیرا بڑا مقدس ہے

دفن ہیں ساغروں میں ہنگامے
کتنی اُجڑی ہوئی بہاروں کے
نام کندہ ہیں آبگینوں پر
کتنے ڈوبے ہوئے ستاروں کے

حشر تک بھی اگر صدائیں دیں
بیت کر وقت پھر نہیں مڑتے
سوچ کر توڑنا انھیں ساقی
ٹوٹ کر جام پھر نہیں جڑتے

زندگی کی دراز پلکوں پر
راستے کا غبار چھایا ہے
آبِ کوثر سے آنکھ کو دھولے
میکدہ پھر قریب آیا ہے

ایک ریزہ ترے تبسم کا
اُڑ گیا تھا شراب خانے سے
حوضِ کوثر بنا دیا جس کو
واعظوں نے کسی بہانے سے

میں راستے کا بوجھ ہوں، میرا نہ کر خیال
تو زندگی کی لہر ہے، لہریں اُٹھا کے چل
لازم ہے میکدے کی شریعت کا احترام
اے دَورِ روزگار ذرا لڑکھڑا کے چل

کتنی صدیوں سے عظمتِ آدم
عجزِ فطرت پہ مُسکراتی ہے
جب مشیت کی کوئی پیش نہ جائے
موت کا فیصلہ سناتی ہے

ذوقِ پرواز اگر رہے غالب
حلقۂ دام ٹوٹ جاتا ہے
زندگی کی گرفت میں آکر
موت کا جام ٹوٹ جاتا ہے

پَر لگا کر اُڑے گا نام ترا
لے فقیرانِ میکدہ کی دُعا
خوب صورت مغنّیہ! ہنس کر
شاعروں کو ذرا شراب پلا

مفلسوں کو امیر کہتے ہیں
آبِ سادہ کو شیر کہتے ہیں
اے خدا! تیرے باخرد بندے
بُزدلی کو ضمیر کہتے ہیں

زندگی ہے کہ اک حسین سزا
زیست اپنی ہے غم پرائے ہیں
ہم بھی کن مفلسوں کی دنیا میں
قرض کی سانس لینے آئے ہیں

مایوس ہوگئی ہے دعا بھی جبین بھی
اُٹھنے لگا ہے دِل سے خدا کا یقین بھی
تسکیں کی ایک سانس ہمیں بخش دیجئے
یہ آسماں بھی آپ کا اور یہ زمین بھی

ماہ و انجم کے سرد ہونٹوں پر
ہم نشیں تذکرہ ہے صدیوں کا
جام اُٹھا اور دل کو زندہ رکھ
آسماں مقبرہ ہے صدیوں کا

نہ خدا ہے نہ ناخدا ساتھی
ناؤ کو آپ ہی چلانا ہے
یا بغاوت سے پار اترنا ہے
یا رعونت سے ڈوب جانا ہے

جن کو ملّاح چھوڑ جاتے ہیں
اُن سفینوں کو کون کھیتا ہے
پوچھتی ہے یہ قسمتِ مزدور
یا خدا رزق کون دیتا ہے

ناخدا کس لئے پریشاں ہے
کشمکش عین کامیابی ہے
گر کنارہ نہیں مقدر میں
قعرِ دریا میں کیا خرابی ہے

جا رہا تھا حرم کو میں لیکن
راستے میں بہ خوبیٔ تقدیر
اک مقام ایسا آگیا جس نے
ڈال دی میرے پاؤں میں زنجیر

اِک شکستہ سے مقبرے کے قریب
اِک حسیں جوئبار بہتی ہے
موت کتنی مداخلت بھی کرے
زندگی بے قرار رہتی ہے

یہ وہ فضا ہے جہاں فرقِ صبح و شام نہیں
کہ گردشوں میں یہاں زندگی کا جام نہیں
دیارِ پاک میں مت پڑھ کلامِ روح افزا
کہ مقبروں میں خطیبوں کا کوئی کام نہیں

مرے دل کی اُداس وادی پر
غنچہ ہائے ملول کھلتے ہیں
گلستانوں پہ ہی نہیں موقوف
جنگلوں میں بھی پھول کھلتے ہیں

سو رہی ہے گلوں کے بستر پر
ایک تصویرِ رنگ و نکہت و ناز
جس کے ماتھے کی نرم لہروں پر
چاندنی رات پڑھ رہی ہے نماز

اے خرابات کے خداوندو
دستِ الطاف کو کھُلا رکھو
جو محبت سے چل کے آجائے
اُس کی امید کو ہرا رکھو

دل کی ہستی بکھر گئی ہوتی
روح کے زخم بھر گئے ہوتے
زندگی آپ کی نوازش ہے
ورنہ ہم لوگ مر گئے ہوتے

کافی وسیع سلسلۂ اختیار ہے
کافی طویل مدت عہدِ بہار ہے
مَیں تیرا ساتھ دوں گا جہاں تک تو چل سکے
اے زندگی تو آپ ہی بے اعتبار ہے

زندگی اِک فریبِ پیہم ہے
مسکرا کر فریب کھاتا جا
روشنی قرض لے کے ساقی سے
سرد راتوں کو جگمگاتا جا

زیست دامن چھڑائے جاتی ہے
موت آنکھیں چرائے جاتی ہے
تھک کے بیٹھا ہوں اک دورا ہے پر
دوپہر سر پہ آئے جاتی ہے

ظلمتوں کو شراب خانے سے
دھن کی خیرات ہوتی جاتی ہے
ساغروں کے بلند ہونے سے
چاندنی رات ہوتی جاتی ہے

خرابات منزل گہِ کہکشاں ہے
وگرنہ ہر اک چیز ظلمت نشاں ہے
لبِ ماہ و انجم پہ ساقی ازل سے
ترا ذکر ہے یا مری داستاں ہے

آخرت کا خیال بھی ساقی
بادۂ وہم کا ایاغ نہ ہو
اس لئے بندگی سے ہوں بیزار
خلد بھی ایک سبز باغ نہ ہو

موت کا سرد ہاتھ بھی ساقی
مجھ کو خاموش کر نہیں سکتا
ساز کا تار ٹوٹ سکتا ہے
تار کا سوز مر نہیں سکتا

ساحل پہ اک تھکے ہوئے جوگی کی بنسری
تلقین کر رہی ہے کنارا ہے زندگی
طوفان میں سفینۂ ہستی کو چھوڑ کر
ملاح گا رہا ہے کہ دریا ہے زندگی

مرمریں مرقدوں پہ وقتِ سحر
میکشی کی بساط گرم کریں
موت کے سنگ دل غلافوں کو
ساغروں کی کھنک سے نرم کریں

اور ارمان اِک نکل جاتا
اِک کلی ہنس کے اور کھل جاتی
کاش اس تنگ دل زمانے سے
اِک حسیں شام اور مل جاتی

گلستانوں میں گھوم لیتا ہوں
بادہ خانوں میں جھوم لیتا ہوں
زندگی جس جگہ بھی مل جائے
اُس کے قدموں کو چوم لیتا ہوں

روح کو ایک آہ کا حق ہے
آنکھ کو اِک نگاہ کا حق ہے
ایک دل میں بھی لے کے آیا ہوں
مجھ کو بھی اِک گناہ کا حق ہے

تمہارے حُسن کو میری نظر لگی ہے ضرور
کہاں ہو پہلے سے، تبدیل ہو گئے ہو تم
خدا کرے، میری آنکھوں سے نور چھن جائے
نگاہِ شوق میں تحلیل ہو گئے ہو تم

صورت کے آئینے میں دلِ پائمال دیکھ
اُلفت کی واردات کا حسنِ مثال دیکھ
جب اس کا نام آئے کسی کی زبان پر
اُس وقت غور سے مرے چہرے کا حال دیکھ

اب بھی سازوں کے تار ہلتے ہیں
اب بھی شاخوں پہ پھول کھلتے ہیں
تم نے ہم کو بھُلا دیا تو کیا
اب بھی راہوں میں چاند ملتے ہیں

چلتے چلتے تمام رستوں سے
مست و مسرور آ گئے ہیں ہم
اب جبیں سے نقاب الٹ دیجئے
شہر سے دور آ گئے ہیں ہم

اے گدا گر خدا کا نام نہ لے
اِس سے انساں کا دل نہیں ہلتا
یہ ہے وہ نام جس کی برکت سے
اکثر اوقات کچھ نہیں ملتا

خوئے لیل و نہار دیکھی ہے
تلخیوں کی بہار دیکھی ہے
زندگی کے ذرا سے ساغر میں
گردشِ روزگار دیکھی ہے

جام اُٹھا اور فضا کو رقصاں کر
خود بخود کوئی رُت نہیں پھرتی
وقت کی تنگ دل صراحی سے
مے کی اِک بوند بھی نہیں گرتی

اے مرا جام توڑنے والے
مَیں تجھے بد دعا نہیں دیتا
مَیں بھی ہوں ایک سنگدل تاجر
جو ہنر کا صلا نہیں دیتا

تیرگی کے گھنے حجابوں میں
دُور کے چاند جھلملاتے ہیں
زندگی کی اُداس راتوں میں
بے وفا دوست یاد آتے ہیں

بحرِ آلام بے کنارا ہے
زیست کی ناؤ بے سہارا ہے
رات اندھیری ہے اور متاعِ امّید
ایک ٹوٹا ہوا ستارا ہے

اب مری حالتِ غمناک پہ کڑھنا کیسا
کیا ہوا مجھ کو اگر آپ نے ناشاد کیا
حادثہ ہے مگر ایسا تو الم ناک نہیں
یعنی اک دوست نے اک دوست کو برباد کیا



اختر انصاری

اختر انصاری

بدایوں یکم اکتوبر ۱۹۰۹ء — رخصت : علی گڑھ ۱۶/اکتوبر ۱۹۸۸ء

اختر انصاری نام، اختر تخلص، بدایوں کے معزز اور تعلیم یافتہ گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۳۰ء میں دہلی یونیورسٹی سے بی اے کیا۔ ۱۹۳۴ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے بی ٹی اور بعد میں اردو میں ایم اے کیا۔ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو سے وابستہ رہے اور ۱۹۵۰ء میں محکمۂ تعلیمات میں منتقل ہوئے۔

اختر انصاری نے ادب کی کئی صنفوں میں طبع آزمائی کی۔ شاعری کی۔ افسانے لکھے اور کئی کتابیں تحریر کیں۔ لیکن ان کی شہرت بحیثیت شاعر ہی قائم ہو سکی۔ اختر کی شاعری حقیقت نگاری اور جذباتیت کی آمیزش کی عمدہ مثال ہے۔ ان کے کلام میں مایوسی، ناکامی، شکست اور حرماں نصیبی کی کیفیتیں نمایاں ہیں۔ اس کے باوجود اُن کی شعری تخلیقات کو مریضانہ ذہن کا ردِ عمل نہیں کہا جاسکتا چونکہ اختر نے اپنے تخیل کو بروئے کار لاکر اُن میں اپنی توانائی اور قوت کا رنگ بھی بھرا ہے۔ اختر انصاری کے تخلیقی عمل میں دماغ سے زیادہ دل کو دخل حاصل تھا۔

اختر کے لہجے کی انفرادیت بھی اُن کے شعری مرتبے میں اضافہ کرتی ہے۔ اُن کا طرزِ بیان سیدھا سادا اور پُرخلوص اور مبالغہ آرائی سے پاک ہے۔ جدید قطعے کی صنف اور اختر انصاری کا نام لازم ملزوم سمجھے جاتے ہیں۔ بعض ناقدین کے خیال میں تو جدید قطعہ اختر انصاری کی خاص ایجاد اور منفرد کارنامہ ہے۔ اُن کے قطعات کا مجموعہ "آبگینے" بے حد مقبول ہے۔ اُن کی دیگر تصانیف میں نغمۂ روح (شعری مجموعہ) بادۂ شبانہ (شعری انتخاب) اور تصوّرِ تعلیم کا پس منظر (نثر) شامل ہیں۔
اختر انصاری کے قطعات، احساس کی نزاکت، جذبات کی شدت اور رومانی کیفیات سے مرصّع ہیں۔

تیرگی کے گھنے حجابوں میں — دور کے چاند جھلملاتے ہیں
زندگی کی اُداس راتوں میں — بے وفا دوست یاد آتے ہیں

الہٰی اس کو محبّت سے کچھ تعلق ہے
جو اس طرح سے ستاتا ہے نغمۂ رنگیں
جہاں رباب کی آواز کان میں آئی
کسی کی یاد نے سینے میں بجلیاں بھر دیں

ہوا تھی ٹھنڈی ٹھنڈی چاندنی تھی اور دریا تھا
کہیں نزدیک ہی جنگل میں کوئی گیت گاتا تھا
فضا میں رس بھرے نغموں کی ہلکی ہلکی بارش تھی
مرے دامن میں چھم چھم آنسوؤں کا مینہ برستا تھا

نشۂ خواب میں مدہوش ہے ساری دنیا
ہر طرف چھوٹ گئے ہیں ظلمتِ شب کے پردے
رات ویران ہے اور میں یہ دعا کرتا ہوں
میرے دل میں جو خلا ہے اُسے کوئی بھر دے

خوں بھرے جام اُنڈیلتا ہوں میں
ٹیس اور درد جھیلتا ہوں میں
تم سمجھتے ہو شعر کہتا ہوں
اپنے زخموں سے کھیلتا ہوں میں

تیری نازک اور لانبی اُنگلیاں
ساز کے تاروں کو جب کرتی ہیں مَس
جھومنے لگتی ہے زہرہ عرش پر
دل پکار اُٹھتا ہے، بس، للّٰہ! بس

ہے غمِ روزگار کا موضوع
اِک چمن جس میں گُل نہیں کھِلتے
چاہتا ہوں کہ کچھ لکھوں اِس پر
لیکن الفاظ ہی نہیں ملتے

اس روپہلی شراب نوریں سے
کاش میں جامِ شعر بھر سکتا!
اے شبِ مہ کے منتشر جلوو!
کاش مَیں تم کو نظم کر سکتا

پھوار، ابر، پرندوں کے گیت، مست ہوا
بھرے کٹوروں کی صورت چھلک رہی ہے فضا
بہار کان میں کچھ کہہ رہی ہے مجھ سے مگر
وہ بے خودی ہے کہ میں کچھ سمجھ نہیں سکتا

نسیم، پھولوں کی رونق، کھِلے ہوئے تارے
فضا میں چھوٹ رہے ہیں ضیا کے فوّارے
رُخِ حسینۂ فطرت سے اُٹھ گئی ہے نقاب
نظر کو ڈھونڈ رہے ہیں حسین نظارے

ہمیشہ وقتِ سحر جب قریب ہوتا ہے
ہوائیں چلتی ہیں، سارا جہان سوتا ہے
تجھے خبر نہیں او غم سے بے خبر! اُس وقت
ترے پڑوس میں اِک غم نصیب روتا ہے

جو پوچھتا ہے کوئی، سُرخ کیوں ہیں آج آنکھیں
تو آنکھیں مل کے میں کہتا ہوں رات سو نہ سکا
ہزار چاہوں مگر یہ نہ کہہ سکوں گا کبھی
کہ رات رونے کی خواہش تھی اور رو نہ سکا

جن کو ہے عیشِ دل میسّر، وہ
ہائے کیا کھل کھلا کے ہنستے ہیں
اور ہم بے نصیب اے اختر
مسکرانے کو بھی ترستے ہیں

ہلکی ہلکی پھوار کے دوران میں
دفعتاً سورج جو بے پردہ ہوا
مَیں نے یہ جانا کہ وحشت میں کوئی
روتے روتے کھل کھلا کر ہنس پڑا

اِن میں رہتی تھی اک ہنسی بن کر
وہ مسرّت جو اب نصیب نہیں
یہی آنکھیں جو آج روتی ہیں
کبھی اختر ہنسا بھی کرتی تھیں

یہ شیریں راگ میرے حافظے کو جگمگاتا ہے
جو دیکھے تھے کبھی آنکھوں نے وہ نقشے دکھاتا ہے
میں اک لمحہ نظارہ کر لوں اپنے عہدِ ماضی کا
ٹھہر او خوش نوا مطرب! مجھے کچھ یاد آتا ہے

مطربہ جب صدائے ساز کے ساتھ
اپنی آواز کو اٹھاتی ہے
تھام لیتا ہوں دل کو میں، لیکن
منھ سے توبہ نکل ہی جاتی ہے

جھومتی ہے فضائے دشت وجبل
عالمِ وجد میں ہے روح میری
میں یہ کہتا ہوں اے ستار نواز!
کوئی جادو ہے انگلیوں میں تری

تیرے گیتوں کی لَے۔ ارے توبہ
یہ طرب یہ نشاط اور یہ لوچ
کیوں نہ دنیا پگھل کے بہہ جائے
اِک ذرا تو ہی اپنے دل میں سوچ

کوئی جنگل میں گا رہا ہے گیت
دھیمی آواز، دُکھ بھرا لہجہ
دل کو گویا یہ مل گیا ہے حکم
اشکِ خوں بن کے آنکھ سے بہہ جا

ہمیشہ جاگتے ہی جاگتے سحر کر دی
کبھی ہنسا۔ کبھی آہیں بھریں کبھی رویا
بنا کے چاند کو اپنا گواہ کہتا ہوں
مَیں آج تک شبِ مہتاب میں نہیں سویا

آبِ دریا میں ہے جس طرح روانی پنہاں
جیسے الفاظ میں ہوتے ہیں معانی پنہاں
نغمہ گر! یونہی تیرے درد بھرے نغموں میں
ہے مرے دردِ محبّت کی کہانی پنہاں

پانی لے سکتے ہیں دریا سے، مگر کوزے میں ہم
بہتے دریا کی روانی بند کر سکتے نہیں
شعر یوں کہنے کو کہہ لیں، لیکن اخترؔ سچ یہ ہے
دل کے محسوسات کو لفظوں میں بھر سکتے نہیں

گوشۂ باغ اور بزمِ طرب
چاندنی، حُسن، شعر اور گانے
پھر بھی میں بے قرار ہوں اخترؔ
چاہتا کیا ہے دل خدا جانے

فضا ہے نور کی بارش سے سیم گوں اس وقت
جہانِ مست پہ طاری ہے اک سکوں اس وقت
نہ چھیڑ دردِ جدائی کی داستاں اے دل
مجھے خبر نہیں میں کس کے پاس ہوں اس وقت

اب کہاں ہوں کہاں نہیں ہوں میں
جس جگہ ہوں وہاں نہیں ہوں میں
کون آواز دے رہا ہے مجھے؟
کوئی کہہ دو یہاں نہیں ہوں میں

چاندنی، تارے، ابر کے ٹکڑے
ہائے کس قہر کی حسین ہے رات
لیجئے وہ پھوار پڑنے لگی
آج کیوں ہوش میں نہیں ہے رات؟

ہائے کیا قہر تھی وہ پہلی نظر
جس میں محسوس یہ ہوا اختر
مجھ پہ گویا کسی نے پھینک دی ہیں
ایک مٹھی میں بجلیاں بھر کر

جا رہا تھا میں سر جھکائے ہوئے
گزری اِک ماہ رُو برابر سے
بھر کے اپنی نظر میں کچھ کرنیں
اُس نے سینے میں ڈال دیں میرے

گیت کے ہاتھوں لٹا جاتا ہوں مَیں
ہائے کیا سے کیا ہوا جاتا ہوں مَیں
مطربہ! اے مطربہ! لینا مجھے
ایک انگڑائی بنا جاتا ہوں مَیں

جی کو ناحق نڈھال کرتے ہو
روح کو پائمال کرتے ہو
آدمی اور گناہ سے پرہیز!
تم بھی اختر کمال کرتے ہو

نیند آتی ہے اِس طرح شب کو
جیسے پینے میں نشہ چڑھتا ہے
صبح اِس طرح سو کے اُٹھتے ہیں
جیسے سیلاب آگے بڑھتا ہے

قلب زندہ ہے۔ لفظ ہیں بے جان
کیجئے کیا اگر نہ چُپ رہیئے
جس کو دنیا زبان کہتی ہے
اُس کو جذبات کا کفن کہیئے

حیف! کیا مبتذل نوائی ہے
فن کی کس درجہ گت بنائی ہے
شاعری تیری اے قصیدہ گو
اصل میں کاسۂ گدائی ہے

گوشۂ باغ کی ملاقاتیں
اور راز و نیاز کی باتیں
اے دل! ارمان رہ نہ جائے کوئی
پھر نہ ہوں گی نصیب یہ راتیں

یہ ملاقات لوٹے لیتی ہے
عشق کی گھات لوٹے لیتی ہے
کرلو اختر گواہ تاروں کو
آج کی رات لوٹے لیتی ہے

محبت! اے کہ تو دیوی ہے غم کی روئے جا
اگر سفینہ ہو نازک تو یونہی کھیتے ہیں
اِن آنسوؤں ہی سے زینت ہے تیرے عارض کی
یہ اشکِ خوں ترے رُخ پر بہار دیتے ہیں

دلِ حسرت زدہ میں ایک شعلہ سا بھڑکتا ہے
محبت آہیں بھرتی ہے، تمنّائیں ترستی ہیں
کوئی دیکھے بھری برسات کی راتوں میں حال اپنا
گھٹا چھائی ہوئی ہوتی ہے اور آنکھیں برستی ہیں

فضا اُمڈی ہوئی ہے اک چھلکتے جام کی مانند
ہوا مخمور ہے بادل غریقِ رنگ و مستی ہیں
میرا سرشار دل مجھ سے یہ کہتا ہے کہ اے اختر
یہ بوندیں پڑ رہی ہیں یا تمنّائیں برستی ہیں

یہ آرزوئیں، یہ جوشِ الم، یہ سیلِ نشاط
یہ دل کہ ہے تپشِ حُسن و عشق کا سوتا
ستم ہے یہ نہیں جاتے بھری جوانی کے
میں ابتدائے جوانی میں مر گیا ہوتا

تمام عمر میں آنسو بہاؤں گا اختر
تمام عمر یہ صدمہ رہے گا میرے ساتھ
کہ اپنے آپ کو میں نے فروخت کر ڈالا
کسی کو پانے کی ناکام آرزو کے ساتھ

پڑھا ہے مَیں نے فسانوں میں جس طرح اختر
میرا شگوفۂ اُمید کیوں نہیں کِھلتا ؟
جو عشق پاتے ہیں کثرت سے ہم کتابوں میں
وہ واقعات کی دنیا میں کیوں نہیں ملتا ؟

کس قیامت کے لمحے تھے اختر
ہائے کیا بے کسی کی گھڑیاں تھیں
تھے فلک پر ستارے بکھرے ہوئے
گود میں آنسوؤں کی لڑیاں تھیں

سعیِ راحت ہو گئی خواب و خیال
ذوقِ ناکامی فسانہ ہو گیا
غم نہ مرنے کا نہ جینے کی خوشی
آہ! اے اختر مجھے کیا ہو گیا ؟

وہ دل نہیں رہا، وہ طبیعت نہیں رہی
وہ شب کو خون رونے کی عادت نہیں رہی
محسوس کر رہا ہوں مَیں جینے کی تلخیاں
شاید مجھے کسی سے محبت نہیں رہی

ہو کے بے فکر تان اُڑائے جا
راگنی اپنے من کی گائے جا
غم نہ کر روزگار کا پیارے
عشق کی بانسری بجائے جا

دل تو روئے مگر میں گائے جاؤں
روح تڑپے میں مُسکرائے جاؤں
شعر کہتا رہوں یونہی اختؔر
بات بگڑی ہوئی بنائے جاؤں

اُجڑی دنیا کو بسایا ہے ذرا دیکھو تو
غم کی محفل کو سجایا ہے ذرا دیکھو تو
چشمِ گریاں، دلِ پُرخوں، جگر زخم آلود
میں نے اِک باغ لگایا ہے ذرا دیکھو تو

حُسن کی داستاں بنا ڈالا
عِشق کا ترجماں بنا ڈالا
بھر کے اعضا میں رقص کا جادو
تو نے اِن کو زباں بنا ڈالا

ہر طرف ایک بے حجابی ہے
بے نقابی ہی بے نقابی ہے
تم بھی آ جاؤ چاندنی بن کر
آج کی رات ماہتابی ہے

یہ ساغرِ غم کی گردش ہے، صہبائے طرب کا دَور ہے یہ
کیا خوب نیا انداز ہے یہ! کیا خوب نرالا طور ہے یہ
فریاد بھی ہے یہ نغمہ بھی، یہ شعر بھی ہے افسانہ بھی
یہ رقص نہیں یہ رقص نہیں، کچھ اور ہے یہ کچھ اور ہے یہ

ہوائیں خنک ، چاندنی پُرسکوں
وفورِ مسرت سے سرشار ہوں
یہ خواہش ہے اس وقت دل میں کہ مَیں
گزرتے ہوئے وقت کو روک لوں

باتیں کرنے میں پھول جھڑتے ہیں
برق گرتی ہے مسکرانے میں
نظریں! جیسے فراخ دل ساقی
خُم لُنڈھائے شراب خانے میں

ایک صبر آزما جُدائی ہے
ملنے جلنے کی بند ہیں راہیں
مَیں نے اُس ماہ رو کی گردن میں
ڈال دی ہیں خیال کی باہیں

موت کی سی پُرسکوں ویرانیاں
عرش سے تا فرش ہیں چھائی ہوئی
چاندنی پھیلی ہوئی ہے ہر طرف
رات کی میّت ہے کفنائی ہوئی

صبح کی تنویر بن کر آئی وہ نازک خرام
ہنس کے بولی ، میرے بادہ خوار شاعر کو سلام
یہ کہا اور کہہ کے یوں نظروں سے اوجھل ہو گئی
جیسے چھپ جائے اندھیری رات میں رنگین شام

دل کو برباد کئے جاتی ہے
غم بدستور دیئے جاتی ہے
مرچکیں ساری امیدیں اختر
آرزو ہے کہ جیئے جاتی ہے

کر دیا حافظے میں حشر بپا
اور ماضی میں زندگی بھردی
اُنگلیوں کو فضا میں لہرا کر
تونے اِک داستاں رقم کردی

کسی خیال میں مدہوش جا رہا تھا میں
اندھیری رات تھی، تاریکیوں کی بارش تھی
نکل گئی کوئی دوشیزہ دل کو چھوتی ہوئی
یہ میرے سازِ جوانی کی پہلی لرزش تھی

سارا جہاں ہے چاند کی کرنوں سے سیم گوں
چھایا ہے دہر پر شبِ مہتاب کا فسوں
آنکھیں کھلی ہیں تاروں کی بیدار ہے فضا
ایسے میں بھی جو سو ئے، میں اب اُسکو کیا کہوں

گلشنِ آرزو کی دید کے بعد:
یاس کا خار زار بھی دیکھو
کی بہاروں کی خوب سیر اختر
اب خزاں کی بہار بھی دیکھو

ایک تصویر کھینچ دی گویا
کیف صہبائے ارغوانی کی
کیوں نہ مستی چھلک پڑے رُخ سے
نیند اور نیند بھی جوانی کی

رات کو بیٹھ کر لبِ دریا
دیکھنا آسماں کے تاروں کا
لوحِ دل پر اُبھار دیتا ہے
نقش گزری ہوئی بہاروں کا

اُدھر دماغ ہیں ساکت، دلوں کو سکتہ ہے
اِدھر سکوت بھی فریاد سے چھلکتا ہے
وہاں تو خلق میں پھنستا نہیں نوالہ بھی
یہاں یہ حال کہ سینے میں سانس اٹکتا ہے

فغانِ غم سرِ دو انجمیں معلوم ہوتی ہے
تپش دل کی بہارِ یاسمیں معلوم ہوتی ہے
مرا کافر مذاقِ حُسن اب تم پوچھتے کیا ہو
مجھے اپنی تباہی بھی حسیں معلوم ہوتی ہے

عمر بھر جینے کی تہمت بھی اُٹھے گی یارب
اور پھر حشر کی زحمت بھی اُٹھے گی یارب
لیکن اپنا یہ جنوں، ہائے یہ جنسِ نایاب
کبھی اِس جنس کی قیمت بھی اُٹھے گی یارب

بہت سے عشرتِ نوروزہ و عید میں ہیں مگن
بہت وہ ہیں جو فریبِ اُمید میں ہیں مگن
زمانہ مست ہے انسان کا لہو پی کر
ہم اپنے خونِ جگر کی کشید میں ہیں مگن

آہ! مرگِ آرزو کا ماجرا اب کیا کہوں
اِک مسلسل یاس کا ہے سامنا اب کیا کہوں
دم بہ دم بجھتی ہی جاتی ہے نشاطِ دل کی جوت
رچ گیا ہے روح میں اک درد سا اب کیا کہوں

زخم کھانے کے دن گئے لیکن
یاد کے زخم تو مہکتے ہیں
آنکھیں اب بھی برستی ہیں آخر
دل کے داغ آج بھی دہکتے ہیں

غمِ دل کا علاج دنیا میں
شائد اِس کے سوا کچھ اور نہ ہو
کہ زمانے کے سارے تیرِ ستم
اپنے دل میں پرو کے بیٹھے رہو

پہنائے آسماں پہ ہیں طاری اُداسیاں
ہے ہے سکوتِ شام کی پیاری اُداسیاں
ہنگامہ ہائے زیست سے فرصت اگر ملے
رکھ لوں اُٹھا کے دل میں یہ ساری اُداسیاں

وہ بحرِ کرب و الم کا خلاصہ ہے یکسر
نچوڑ ہے وہ تپش کی اُبلتی ندیوں کا
مرے وجود کو جس درد نے تراشا ہے
وہ درد راز ہے لاکھوں سسکتی صدیوں کا

اِس معیشت کے سائے میں ہمدم
اچھی صورت ہے وہ بھی جینے کی
جس میں دو چار دن کی روٹی ملے
اور سزا سال چھ مہینے کی

سچ تو یہ ہے جہاں میں میرے بعد
نغمے دن رات یونہی برسیں گے
اور کیا کیا حسین زمزمے ہائے
میرے ذوقِ نوا کو ترسیں گے

فدائے منزلِ بے جادہ ہیں خدا رکھے
خرابِ ساغرِ بے بادہ ہیں خدا رکھے
ہماری حُسن پرستی بھی خوب شے ہے کہ ہم
حسیں غموں کے بھی دلدادہ ہیں خدا رکھے

یہ بوسیدہ پھٹی گدڑی، یہ سوراخوں بھری کملی
جسے سب آسماں کے نام سے موسوم کرتے ہیں
تری رحمت کے قرباں! اِس کو نیچے پھینک دے یارب
زمیں والے بہت راتوں کی سردی میں ٹھٹھرتے ہیں

ہم زمزمے نشاطِ جنوں کے نہ گا سکے
جلوے نہ سوز و درد و تپش کے لٹا سکے
اہلِ جہاں کی کم نظری پر خدا کی مار
کیا کیا نکات تھے کہ زباں پر نہ آ سکے

محفلِ شوق رچانے میں تامّل نہ کروں
ہوسِ عیش بڑھانے میں تامّل نہ کروں
اور جب دستِ اجل جامِ فنا پیش کرے
تو اُسے بڑھ کے اُٹھانے میں تامل نہ کروں

اُسی نے مسخ کیا آدمی کی فطرت کو
اسی نے روگ لگایا خلوصِ نیت کو
جہاں سے نیکی بے لوث اُٹھ گئی یارب
اٹھا کے پھینک دے دوزخ میں اپنی جنت کو

زندگی فرد کی شہ پارۂ فن ہے اُس کا
کون ہے ہم میں جو صناع نہیں، فنکار نہیں
لیکن افسوس یہ ہے روحِ جمالِ ہستی،
پھر بھی شرمندۂ گل کاریِ اظہار نہیں

اپنا سکا جہاں نہ خدا ہی کے ہو سکے
افلاک سے بنی نہ زمینوں ہی سے پٹی
دنیا میں روح کو نہ ملا کوئی ہم وطن
اپنی تو ساری عمر ہی پردیس میں کٹی



فیض احمد فیض

فیض احمد فیض

آمد : سیالکوٹ ۱۳/فروری ۱۹۱۱ء رخصت : لاہور ۲۰/نومبر ۱۹۸۴ء

فیض احمد نام، فیض تخلص، اُن کے والد چودھری محمد خان بیرسٹر تھے۔ ابتدائی عربی اور فارسی تعلیم شمس العلماء سید میر حسن سے حاصل کی جو اقبال کے بھی استاد رہ چکے تھے۔ لاہور کے گورنمنٹ کالج سے بی اے اور اورینٹل کالج سے ایم اے کیا۔ ایم اے او کالج امرتسر میں انگریزی زبان کے لیکچرار بھی رہے۔

فیض دوسری جنگِ عظیم کے دوران بحیثیت کیپٹن فوج میں ملازم ہوئے اور لفٹننٹ کرنل کے عہدے تک پہنچے۔ سنہ ۱۹۴۷ء میں فوج سے مستعفی ہوئے۔ پاکستان آرٹ کونسل لاہور کے سکریٹری اور ہارون کالج کے پرنسپل رہے نیز ادبِ لطیف، پاکستان ٹائمز، امروز، اور لیل و نہار کے مدیر رہے اور افرو ایشین رائٹرز ایسوسی ایشن کے ادبی جریدے 'لوٹس' کی ادارت بھی کی۔

راولپنڈی سازش کیس میں فیض کو دوبار کئی سالوں کی جیل کاٹنی پڑی۔

فیض نے شاعری میں کسی کی شاگردی نہیں کی۔ انھیں 'ترقی پسند تحریک' کے پرچم تلے اُبھرنے والے شاعروں میں اہم ترین مرتبہ و مقام حاصل ہے۔ حق تو یہ ہے کہ غالب اور اقبال کے بعد فیض ہی اُردو کے مقبول ترین شاعر ہیں۔ اُن کا کلام خواص اور عوام دونوں کے لئے یکساں کشش رکھتا ہے اور ترقی پسند تحریک سے وابستگی کے باوجود سیاسی نعرے بازی سے پاک ہے۔ اُن کی چودہ اہم تصانیف میں سے چند یہ ہیں۔ نقشِ فریادی، دستِ صبا، زندان نامہ، دستِ تہِ سنگ، میزان (مضامین)، شہرِ یاراں، متاعِ لوح و قلم (نثر) اور سارے سخن ہمارے، وغیرہ۔

فیض بحیثیت شاعر عالمگیر شہرت کے مالک ہیں۔ وہ اُردو کے واحد شاعر ہیں جنھیں سنہ ۱۹۶۲ء میں روس کے لینن ادبی انعام سے نوازا گیا۔ ادارہ 'فن اور شخصیت' کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس نے فیض کی شخصیت کے شایانِ شان خاص نمبر اُن کی حیات ہی میں مرتب کر کے شائع کیا۔ فیض کی نظمیں اُردو شاعری کا بے نظیر سرمایہ ہیں۔ اُن کی غزلیں اور قطعات بھی اپنا منفرد مقام رکھتے ہیں۔ اُن کی لفظیات کی غنائیت اور لہجے کی دھیمی اور خواب آور فضا نے اُن کے کلام میں سحر انگیزی پیدا کر دی ہے ؎

مقام فیض کوئی راہ میں جچا ہی نہیں
جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے

رات یوں دل میں تری کھوئی ہوئی یاد آئی
جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آجائے
جیسے صحراؤں میں ہولے سے چلے بادِ نسیم
جیسے بیمار کو بے وجہ قرار آجائے

دِل رہینِ غمِ جہاں ہے آج
ہر نفس تشنۂ فغاں ہے آج
سخت ویراں ہے محفلِ ہستی
اے غمِ دوست! تو کہاں ہے آج

فضائے دل پہ اُداسی بکھرتی جاتی ہے
فسردگی ہے کہ جاں تک اترتی جاتی ہے
فریبِ زیست سے قدرت کا مدّعا معلوم
یہ ہوش ہے کہ جوانی گزرتی جاتی ہے

متاعِ لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خونِ دل میں ڈبولی ہیں انگلیاں میں نے
زباں پہ مُہر لگی ہے تو کیا کہ رکھ دی ہے
ہر ایک حلقۂ زنجیر میں زباں میں نے

وقتِ حرمان و یاس رہتا ہے
دل ہے اکثر اُداس رہتا ہے
تم تو غم دے کے بھول جاتے ہو
مجھ کو احساں کا پاس رہتا ہے

پوچھ، جب سے ترا انتظار کتنا ہے
جن دنوں سے مجھے تیرا انتظار نہیں
ہی عکس ہے اُن اجنبی بہاروں میں
تیرے لب ترے بازو، ترا کنار نہیں

صبا کے ہاتھ میں نرمی ہے اُن کے ہاتھوں کی
ٹھہر ٹھہر کے یہ ہوتا ہے آج دل کو گماں
وہ ہاتھ ڈھونڈ رہے ہیں بساطِ محفل میں
کہ دل کے داغ کہاں ہیں نشستِ درد کہاں

جمال نگاہوں میں لے کے اُٹھا ہوں
ھر گئی ہے فضا تیرے پیرہن کی سی
یم تیرے شبستاں سے ہو کے آئی ہے
ی سحر میں مہک ہے ترے بدن کی سی

ہمارے دم سے ہے کوئے جنوں میں اب بھی خجل
عبائے شیخ و قبائے امیر و تاجِ شہی
ہمیں سے سنّتِ منصور و قیس زندہ ہے
ہمیں سے باقی ہے گُل دامنی و کج کلہی

دلبری ٹھہرا زبانِ خلق کھلوانے کا نام
اب نہیں لیتے پری رو زلف بکھرانے کا نام
اب کسی لیلیٰ کو بھی اقرارِ محبوبی نہیں
اِن دنوں بدنام ہے ہر ایک دیوانے کا نام

آج تنہائی کسی ہمدمِ دیریں کی طرح
کرنے آئی ہے مری ساقی گری شام ڈھلے
منتظر بیٹھے ہیں ہم دونوں کہ مہتاب اُبھرے
اور ترا عکس جھلکنے لگے ہر سائے تلے

بامِ مینا سے ماہتاب اُترے
دستِ ساقی میں آفتاب آئے
ہر رگِ خوں میں پھر چراغاں ہو
سامنے پھر وہ بے نقاب آئے

اس طرح اپنی خامشی گونجی
گویا ہر سمت سے جواب آئے
فیض تھی راہ سر بسر منزل
ہم جہاں پہنچے، کامیاب آئے

میخانے کی رونق ہیں کبھی خانقہوں کی
اپنا لی ہوس والوں نے جو رسم چلی ہے
دلداریٔ واعظ کو ہمیں باقی ہیں ورنہ
اب شہر میں ہر رندِ خرابات ولی ہے

نہ آج لطف کر اتنا کہ کل گزر نہ سکے
وہ رات جو کہ ترے گیسوؤں کی رات نہیں
یہ آرزو بھی بڑی چیز ہے مگر ہمدم
وصالِ یار فقط آرزو کی بات نہیں

فکرِ سود و زیاں تو چھوٹے گی
منتِ ایں و آں تو چھوٹے گی
خیر، دوزخ میں مئے ملے نہ ملے
شیخ صاحب سے جاں تو چھوٹے گی

صبح پھوٹی تو آسماں پہ ترے
رنگ و رخسار کی پھوار گری
رات چھائی تو روئے عالم پر
تیری زلفوں کی آبشار گری

تمام شب دلِ وحشی تلاش کرتا ہے
ہر اک صدا میں ترے حرفِ لطف کا آہنگ
ہر ایک صبح ملاتی ہے بار بار نظر
ترے دہن سے ہر اک لالہ و گلاب کا رنگ

تمہارے حُسن سے رہتی ہے ہمکنار نظر
تمہاری یاد سے دل ہم کلام رہتا ہے
رہی فراغتِ ہجراں تو ہو رہے گا طے
تمہاری چاہ کا جو جو مقام رہتا ہے

کِھلے جو ایک دریچے میں آج حُسن کے پھول
تو صبح جھوم کے گُل زار ہو گئی یکسر
جہاں کہیں بھی گرا نور اُن نگاہوں سے
ہر ایک چیز طرحدار ہو گئی یکسر

رات ڈھلنے لگی ہے سینوں میں
آگ سلگاؤ آبگینوں میں
دلِ عشّاق کی خبر لینا
پھول کھلتے ہیں اِن مہینوں میں

یہ خوں کی مہک ہے کہ لبِ یار کی خوشبو
کس راہ کی جانب سے صبا آتی ہے دیکھو
گلشن میں بہار آئی کہ زنداں ہوا آباد
کس سمت سے نغموں کی صدا آتی ہے دیکھو

نہ دید ہے نہ سخن، اب نہ حرف ہے نہ پیام
کوئی بھی حیلۂ تسکیں نہیں اور آس بہت ہے
امیدِ یار، نظر کا مزاج، درد کا رنگ
تم آج کچھ بھی نہ پوچھو کہ دل اُداس بہت ہے

ہم خستہ تنوں سے محتسبو کیا مال منال کا پوچھتے ہو
جو عمر سے ہم نے بھر پایا سب سامنے لائے دیتے ہیں
دامن میں ہے مشتِ خاکِ جگر، ساغر میں ہے خونِ حسرتِ مے
لو ہم نے دامن جھاڑ دیا، لو جام الٹائے دیتے ہیں

آ گئی فصلِ سکوں چاک گریباں والو
سِل گئے ہونٹ کوئی زخم سلے یا نہ سلے
دوستو بزم سجاؤ کہ بہار آئی ہے
کِھل گئے زخم، کوئی پھول کِھلے نہ کِھلے

ہزار درد شبِ آرزو کی راہ میں ہے
کوئی ٹھکانہ بتاؤ کہ قافلہ اُترے
قریب اور بھی آؤ کہ شوقِ دید مٹے
شراب اور پلاؤ کہ کچھ نشہ اُترے

مقتل میں نہ مسجد نہ خرابات میں کوئی
ہم کس کی امانت میں غمِ کارِ جہاں دیں
شاید کوئی ان میں سے کفن پھاڑ کے نکلے
اب جائیں شہیدوں کے مزاروں پہ اذاں دیں

اپنے انعامِ حسن کے بدلے
ہم تہی دامنوں سے کیا لینا
آج فرقت زدوں پہ لطف کرو
پھر کبھی صبر آزما لینا

ڈھلتی ہے موجِ مے کی طرح رات ان دنوں
کھلتی ہے صبحِ گل کی طرح رنگ و بو سے پُر
ویراں ہیں جام پاس کرو کچھ بہار کا
دل آرزو سے پُر کرو آنکھیں لہو سے پُر

باقی ہے کوئی ساتھ تو بس ایک اُسی کا
پہلو میں لئے پھرتے ہیں جو درد کسی کا
اِک عمر سے اس دُھن میں کہ اُبھرے کوئی خورشید
بیٹھے ہیں سہارا لئے شمعِ سحری کا



اسرار الحق مجاز

مجازؔ

آمد : ردولی (ضلع بارہ بنکی) ۱۹/اکتوبر ۱۹۱۱ء رخصت : لکھنؤ ۵/دسمبر ۱۹۵۵ء

اسرارالحق نام، مجازؔ تخلص۔ قصبہ ردولی، ضلع بارہ بنکی میں پیدا ہوئے۔ لکھنؤ، آگرہ اور علی گڑھ میں تعلیم پائی۔ آل انڈیا ریڈیو میں ملازمت کی۔ بعد ازاں ملازمت ترک کر کے مستقلاً شاعری کرنے لگے۔

مجازؔ اپنی زندگی ہی میں انتہائی ہر دل عزیز شاعر بن چکے تھے۔ ہر محفل اور مشاعرے میں عوام اور خواص اُن کی نظموں اور غزلوں پر سر دُھنتے تھے۔ اُن کے کلام کی رومانیت اور غنائیت نے ہر ایک کو اپنا گرویدہ بنالیا تھا۔

مجازؔ کو ترقی پسند تحریک نے بھی متاثر کیا۔ وہ اس کے ہمنوا بن گئے اور انقلابی نغمے گانے لگے۔ تاہم مجازؔ مزاجاً رومانی تھے اور انقلاب کے تعلق سے اُن کا نظریہ محض رومانی تصوّرات پر قائم تھا۔ اُن کے کلام میں وہ سیاسی اور سماجی شعور نظر نہیں آتا جو دوسرے اہم ترقی پسند شعراء کے کلام کا طرۂ امتیاز ہے۔

مجازؔ ایک انتہائی حسّاس طبیعت رکھتے تھے اور اپنے ماحول کی ابتری سے بے حد متاثر تھے۔ مزاج چونکہ بنیادی طور پر رومانی تھا اِس لئے سماجی موضوعات کو برتتے وقت بھی انہوں نے رومانی طرز کو اپنایا۔ شدتِ احساس مجازؔ کے کلام کی سب سے اہم خصوصیت ہے۔ اِس کے علاوہ زبان و بیان کی سلاست نے اُن کے کلام کو دلفریب بنانے میں بڑا اہم کردار ادا کیا ہے۔ ’آہنگ‘ اُن کا مجموعۂ کلام ہے۔

مجازؔ نے کم عمری میں وفات پائی۔ اپنی زندگی ہی میں وہ مقبولیت حاصل کر چکے تھے اور اُن کا شمار اُردو کے اہم شعراء میں ہوتا ہے ؎

اب اس کے بعد صبح ہے اور صبحِ نو مجازؔ
ہم پر ہے ختم شامِ غریبانِ لکھنؤ

میکدہ چھوڑ کے مَیں تیری طرف آیا ہوں
سرفروشوں سے میں باندھے ہوئے صف آیا ہوں
لاکھ ہوں مَے کشِ آوارہ و آشفتہ مزاج
کم سے کم آج تو شمشیر بکف آیا ہوں

تاج جب مرد کے ماتھے پہ نظر آتا ہے
یک بیک خوں مری آنکھوں میں اُتر آتا ہے
جب نظر آتا ہے عورت کی جبیں پر مجھ کو
عجز و تسلیم کا ہر نقش اُبھر آتا ہے

شاعر ہوں اور امیں ہوں عروسِ سخن کا مَیں
کرنل نہیں ہوں خان بہادر نہیں ہوں مَیں
کرنل سہی میں خان بہادر سہی مجاز
سب دوستوں کی ضد ہے تو شاعر نہیں ہوں مَیں

نہ اُن کا ذہن صاف ہے نہ میرا قلب صاف ہے
تو کیوں دلوں میں جاگزیں وہ بنتِ صد عفاف ہے
مجاز آہ کیا کرے وہ دوست بھی حریف بھی
فلک تو اب بھی نرم ہے، زمین ہی خلاف ہے

مجھے ساغر دوبارہ مل گیا ہے
تلاطم میں کنارا مل گیا ہے
مری بادہ پرستی پر نہ جاؤ
جوانی کو سہارا مل گیا ہے

مجرمِ سرتابیٔ حُسنِ جواں ہو جایئے
گُل فشانی تا کُجا، شعلہ فشاں ہو جایئے
کھایئے گا اِک نگاہِ لطف کا کب تک فریب
کوئی افسانہ بنا کر بدگماں ہو جایئے

وقت کی سعیٔ مسلسل کارگر ہوتی گئی
زندگی لحظہ بہ لحظہ مختصر ہوتی گئی
سانس کے پردوں میں بجتا ہی رہا سازِ حیات
موت کے قدموں کی آہٹ تیز تر ہوتی گئی

کُفر کیا، تثلیث کیا، الحاد کیا، اسلام کیا
تو بہر صورت کسی زنجیر میں جکڑا ہوا
توڑ سکتا ہے تو پہلے توڑ دے سب قید و بند
بیڑیوں کے ساز پر نغماتِ آزادی نہ گا

دل کو محوِ غمِ دلدار کئے بیٹھے ہیں
رند بنتے ہیں مگر زہر پئے بیٹھے ہیں
چاہتے ہیں کہ ہر اِک ذرّہ شگوفہ بن جائے
اور خود دل ہی میں اِک خار لئے بیٹھے ہیں

زندگی ساز دے رہی ہے مجھے
سحر و اعجاز دے رہی ہے مجھے
اور بہت دور آسمانوں سے
موت آواز دے رہی ہے مجھے



احسان دانش

احسان دانش

آمد: قصبہ کاندھلہ (ضلع مظفر نگر) ۱۹۱۱ء — رخصت: لاہور ۲۱ / مارچ ۱۹۸۲ء

قاضی احسان الحق نام، احسان تخلص، والد کا نام قاضی دانش علی تھا۔ اسی مناسبت سے احسان دانش لکھا کرتے تھے۔ اُن کا خاندان قاضیوں اور شرفاء کا خاندان تھا لیکن احسان نے بے حد عسرت اور مفلسی کے ماحول میں آنکھیں کھولیں۔ پرائمری اسکول تک کی تعلیم جیسے تیسے مکمل کی۔ حافظ محمد مصطفےٰ سے عربی۔ فارسی بھی سیکھی اور بہت کم عمری میں میونسپلٹی میں مزدوری کرنے لگے۔ ان کا رجحان شروع ہی سے لکھنے پڑھنے کی جانب مائل تھا اسلئے مزدوری کے ساتھ ساتھ مطالعہ بھی کرتے رہے۔ قاضی محمد ذکی کے کتب خانہ سے بہت استفادہ کیا۔ تلاشِ معاش میں لاہور پہنچے اور مزدوری، باغبانی اور چوکیداری جیسے پیشوں کی صبر آزما منزلوں سے گزر کر ایک بکڈپو کی ملازمت تک پہنچے۔

احسان نے کوئی باقاعدہ تعلیم حاصل نہیں کی تھی اِس لئے وہ اپنے خیالات اور پروازِ فکر کو ایک قطعی سمت نہیں دے سکے۔ افلاس اور مزدوری کے ماحول نے اُن کی دماغ میں انقلاب کی چنگاریاں تو روشن کی تھیں لیکن انقلاب کے تعلق سے اُن کا رویّہ بے انتہا جذباتی اور رومانی تھا۔ وہ انقلاب کو طبقاتی کش مکش کے تناظر میں دیکھنے سے قاصر تھے۔ وہ بہت زود گو شاعر تھے۔ ان کی تصانیف میں حدیثِ ادب، دردِ زندگی، نوائے کارگر، چراغاں، آتشِ خاموش، جادۂ نو، زخم و مرہم وغیرہ جیسے شعری مجموعے اور گورستان (والد کا مرثیہ) اور جہانِ دانش (خود نوشت سوانح عمری) بھی شامل ہے۔ اِن کے علاوہ احسان کے تقریباً بارہ شعری مجموعے غیر مطبوعہ ہیں۔

احسان کی نظموں میں مزدوروں اور مفلسوں کی زندگی کی بڑی دردناک جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ وہ واقعات اور مناظر کی حقیقی تصویر کشی میں مہارت رکھتے تھے۔ انہوں نے غزلیں بھی کہی ہیں لیکن ان کا مزاج اور زبان تغزل سے میل نہیں کھاتی۔ علی سردار جعفری نے قطعات کے تعلق سے اپنی رائے میں کہا ہے کہ جدید الاسلوب قطعہ کی شروعات ہی احسان دانش نے کی تھی ـــــ

جو تیرے آستاں سے لوٹ آئے
جنّتِ دو جہاں سے لوٹ آئے

پڑھ رہی ہیں رات کی خاموشیاں افسونِ خواب
تھم گیا ہے اک پیانو بجتے بجتے بام پر
ہے مگر احساس سے موسیقت کی چھیڑ چھاڑ
دل پہ جیسے دور سے رکشے کی گھنٹی کا اثر

دوپہر میدان گرمی حبس ابر بے متاع
سرنگوں ہے خار و خس پر اک گلِ فیروزہ فام
نادم و بے مایہ محزون مضمحل اندوہگیں
جیسے اک بے رحم و بے انصاف آقا کا غلام

مفلسی اور اس پہ گھر پر ہم نشینوں کا ہجوم
تیرگی میں یاس کی دھندلا گیا حسنِ اُمید
اس طرح ہے دل پہ اک افسردگی چھائی ہوئی
جس طرح پردیس میں بیکار مزدوروں کی عید

بیٹھے بیٹھے ان کی محفل یاد آجاتی ہے جب
دیکھتی ہے یہ سماں تخیّل کی اونچی نگاہ
جیسے تھوڑی دیر ننھی بوندیاں پڑنے کے بعد
چرخ پر خالی سمٹتے پھیلتے ابرِ سیاہ

حوض میں گر پڑا گلاب کا پھول
پاس لانے سے دُور جاتا ہے
جیسے مدّت میں ملنے والے کا
نام مشکل سے یاد آتا ہے

دہلی کا اک رئیس بہ ہنگامِ جاں کنی
سر دھن رہا تھا چارہ گروں میں گھرا ہوا
جیسے فسوں گروں کے جھمیلے میں نیم شب
کھیلے سیاہ ناگ کا تازہ ڈسا ہوا

دوپہر ہونے کو ہے سنّا گیا جنگل تمام
اِک کرن شاخوں سے چھن کر آرہی ہے پھول پر
جس طرح اک گاؤں کی دوشیزۂ معصوم پر
شہر کے بے غیرت دبلے مہرانساں کی نظر

شام اور رستے میں ریوڑ کے گذرنے سے غبار
جُھٹپٹے میں ذرّہ ذرّہ آنکھ جھپکاتا ہوا
جنگلوں میں منتظر خاموشیاں چھائی ہوئی
جیسے کوئی تھم گیا ہو راگنی گاتا ہوا

بھورے بھورے بادلوں سے آسماں لبریز ہے
اِس طرح ضَوپاش ہے رہ رہ کے ماہِ سیم فام
جیسے ساحل کی بلندی سے بھری برسات میں
گدلے پانی میں حسیں مچھلی کا اندازِ خرام

ہوا کے سیّال بازوؤں پر گھٹا کے شب رنگ کارواں ہیں
نسیمِ مستانہ رقص میں ہے فضا میں نشّہ سا چھا رہا ہے
خنک ترائی کے سنگ پارے اتر پر ہوئے پڑے ہیں
کہ جیسے کوئی حسیں نہا کر گھنیری زلفیں سُکھا رہا ہے

مینہ برس کر تھم گیا ہے چھٹ گئے ابرِ سیاہ
ٹہنیاں ہل کر ہوا سے گر رہی ہیں بوندیاں
جس طرح یادِ وطن میں ڈوبتے سورج کے وقت
قید خانے میں نئے قیدی کے اشکوں کا سماں

مفلسی کے وقت اکثر عشرتِ رفتہ کی یاد
یوں دکھاتی ہے جھلک آئینۂ ادراک پر
دوپہر میں جس طرح دریا سے میداں کی طرف
چلتے پھرتے ابر کے ٹکڑوں کا سایہ خاک پر

رو رہا تھا گود میں اماں کی اک طفلِ حسیں
اس طرح پلکوں پہ آنسو ہو رہے تھے بے قرار
جیسے دیوالی کی شب ہلکی ہوا کے سامنے
گاؤں کی نیچی منڈیروں پر چراغوں کی قطار

ہم نشیں اُف اختتامِ بزمِ مے نوشی نہ پوچھ
ہو رہا تھا اس طرح محسوس ہوش آنے کے بعد
جس طرح دیہات کے اسٹیشنوں پر دن ڈھلے
اک سکوتِ مضمحل گاڑی گذر جانے کے بعد

جب کوئی جگنو چمکتا ہے اندھیری رات میں
اس طرح ظلمت میں لہراتی ہے نورانی لکیر
جیسے ساحل پر گرجتے بادلوں کے سائے میں
جنبشِ امواج سے نادار مے کش کا ضمیر

یاس میں بیداریٔ احساس کا عالم نہ پوچھ
ٹھیس یوں لگتی ہے دل پہ طعنۂ ہمراز سے
جس طرح سردی کی افسردہ اندھیری رات میں
آنکھ کھُل جاتی ہے چوکیدار کی آواز سے

جب کسی کی یاد آ کر تلملا جاتا ہے دل
جگمگا اُٹھتی ہے کچھ اس شان سے بزمِ دماغ
جیسے ساون کی برستی رات میں اِک نازنیں
صحن میں زینے سے اُترے ہاتھ میں لے کر چراغ

آسماں پر ہیں خراماں ابر پاروں کے ہجوم
اِس طرح کھُل کھُل کے چھُپتی ہے جبینِ آفتاب
جس طرح ہمسایوں کی آمد سے ہنگامِ سحر
گھر میں شرمیلی نئی دلہن کا اندازِ نقاب

چوم کر اس بُت کی پیشانی کو پچھتانا پڑا
کھنچ گیا میرے لبِ لعلِ محبت سے عسل
جس طرح عصیاں شعاروں کی سیہ کاری کے بعد
کھوکھلی ثابت ہوا کرتی ہے تعمیرِ عمل

گدا ہوں مجھ کو لیکن دولتِ کونین حاصل ہے
وہ آئیں گھر مرے تقدیر تھی ایسی کہاں میری
میں اُن کو دیکھ کر احساں یہ محسوس کرتا ہوں
کہ جیسے مل رہی ہو مجھ کو عمرِ رائیگاں میری

رات ہے برسات ہے مسجد میں روشن ہے چراغ
پڑ رہی ہے روشنی بھیگی ہوئی دیوار پر
جیسے اک بیوہ کے آنسو ڈوبتے سورج کے وقت
تھم گئے ہوں بہتے بہتے چمپئی رخسار پر

اس طرح آتے ہیں انجامِ محبت کے خیال
عشرتوں میں دل کو پیغامِ الم دیتے ہوئے
جیسے کھیتوں کے کناروں پر اترتی دھوپ میں
سرنگوں شاخوں کے سائے کروٹیں لیتے ہوئے

شام کے زریں جلوؤں پر سیاہی آ گئی
چھا گئی خاموش جنگل میں اندھیرے کی سپاہ
جیسے اک دوشیزۂ دیہات کا شادی کے بعد
شہر میں رہنے سے ہو جاتا ہے باطن تک سیاہ

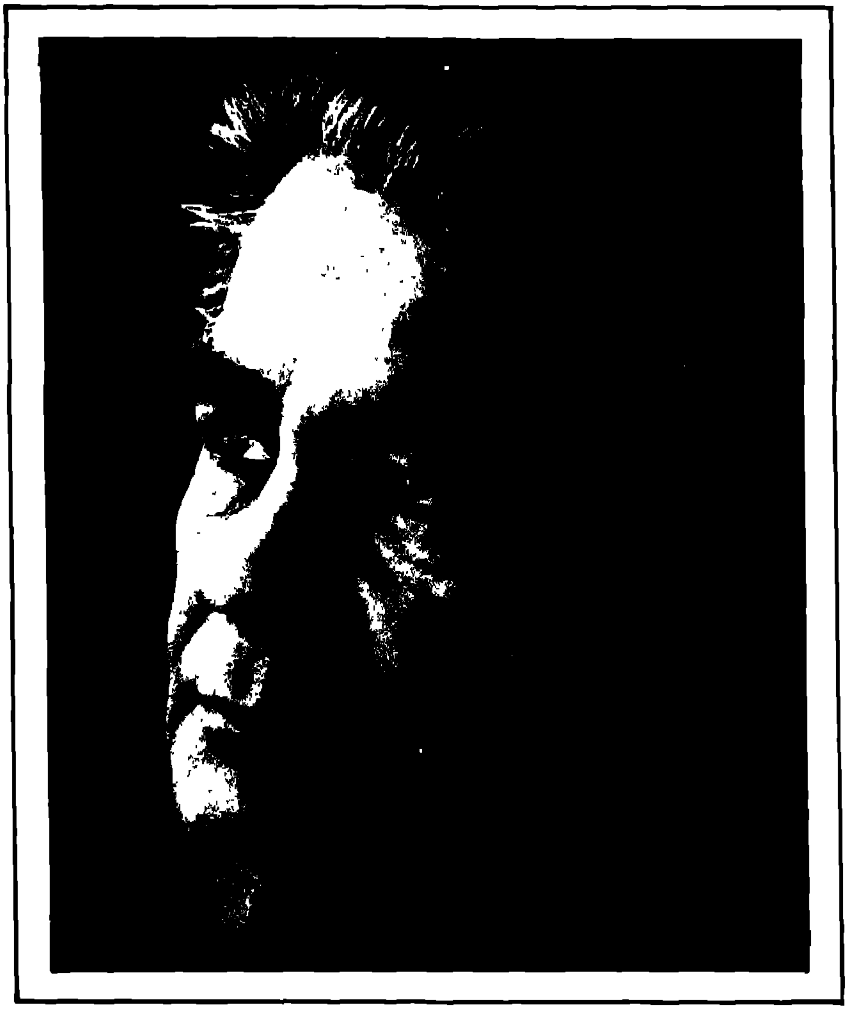
ریل نے سیٹی بجائی شور و دامن چل دیئے
چھا گیا ایسا نشاطِ عقل پر رنج و ملال
جیسے اک حساس کو پردیس میں سونے کے وقت
دیس کی محبوب و نا ہموار گلیوں کا خیال

گرمیاں، حبس، رات، تاریکی
اک دیا دور ٹمٹماتا ہے
جیسے اک پُر خلوص انساں کا
مشکلوں میں خیال آتا ہے

ہم نشیں یاس کے دھندلکے میں
رحمتِ حق کا جب خیال آیا
مسکرائیں نحیف امیدیں
روئے ایماں پہ نور لہرایا
جیسے ساون میں سبزہ زاروں پر
ہو کہیں دھوپ اور کہیں سایہ

جا رہی تھی ریل سوئے لکھنؤ کل نیم شب
چاندنی برسا رہا تھا چودھویں کا ماہتاب
میں نے جب دیکھا دریچے سے بیاباں کی طرف
آ رہا تھا اس طرح گاڑی کا سایہ ہم رکاب
جس طرح پیری میں نم آلود سجدوں کے طفیل
چشمِ الطاف و کرم کے ساتھ ہی خوفِ عذاب

دم بخود ہیں شام کے پرتو سے بانسوں کے درخت
ہے مآلِ اوج سے خورشید غرقِ انفعال
چھا رہا ہے شورشِ گل زار پر ابرِ سکوت
چرخ کی غمگیں بلندی سے برستا ہے ملال
ہچکیاں لیتے ہیں ذرّے سسکیاں بھرتا ہے دشت
سست ہے نبضِ ہوا کیلے کے پتے ہیں نڈھال
ہو بہو ہے اس طرح یہ ماتمستانِ خموش
جیسے اک آلودۂ عصیاں کو عقبیٰ کا خیال



علی سردار جعفری

علی سردار جعفری

آمد: بلرام پور (ضلع گونڈہ) ۲۹/نومبر ۱۹۱۳ء

علی سردار جعفری نام اور یہی تخلص۔ دہلی یونیورسٹی سے بی۔ اے اور لکھنؤ یونیورسٹی سے ایم اے کیا۔ طالب علمی کے زمانے سے ہی سیاسی وسماجی مسائل میں دلچسپی لیتے رہے۔ جدوجہدِ آزادی میں شریک رہے اور اسی پاداش میں دو بار جیل بھی جا چکے ہیں۔

علی سردار جعفری ترقی پسند تحریک کے ہراول دستے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اُن کی ادبی اہمیت جتنی اُن کی شاعری کی بنا پر ہے اتنی ہی ان کی تنقیدی کاوشوں اور ادبی صحافت کی وجہ سے۔

جعفری بنیادی طور پر نظم کے شاعر ہیں۔ لیکن دوسری اصنافِ سخن میں بھی انھوں نے قابلِ قدر اضافے کئے ہیں۔ ترقی پسند شعرا نے شاعری میں ایک موضوعاتی انقلاب تو ضرور لایا تھا تاہم ہیئتی تجربے بہت کم کئے تھے۔ دوسرے ترقی پسند شعراء کے مقابلے میں جعفری نے ہیئتی تجربے زیادہ کئے ہیں۔

اُن کی اہم تصانیف کئی ہیں جن میں سے چند یہ ہیں۔ منزل (افسانے)، پرواز، کس کا خون ہے (امن نامہ)، پیار (ڈرامے)، خون کی لکیر (نظمیں)، لکھنؤ کی پانچ راتیں (نثر) اقبال شناسی (نثر)، لہو پکارتا ہے (نظمیں)، کے علاوہ متعدد تراجم اور مختلف موضوعات پر تین سو سے زائد مضامین۔ وغیرہ۔

جعفری کو پدم شری کے خطاب کے علاوہ مدھیہ پردیش سرکار کا اقبال سمان بھی مل چکا ہے۔

جعفری کی شاعری میں فکر کی بلندی اور جذبے کی تازگی کا امتزاج ملتا ہے۔ اُنکا لہجہ خطیبانہ اور آہنگ بلند ہے۔ بحیثیت نثار جعفری کی اہمیت مسلّم ہے۔ وہ ایک انتہائی ذہین اور باشعور انسان ہیں۔ اُردو، فارسی کے علاوہ انگریزی پر بھی دسترس رکھتے ہیں۔ جعفری کے نظریۂ شعر سے اختلاف کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اُردو میں اُن کی ادبی اہمیت سے انکار ممکن نہیں ہے

نگاہیں منتظر ہیں ایک خورشیدِ تمنّا کی
ابھی تک جتنے مہر و ماہ آئے نا تمام آئے

ل

حسن تیرا کبھی گل اور کبھی مہتاب ہوا
کبھی آئینہ کبھی مہرِ جہاں تاب ہوا
دلِ بیتاب مرا ریگِ رواں کی صورت
تیرے دیدار کی شبنم سے نہ سیراب ہوا

عطا ہوئی ہے مرے دل کی سلطنت تجھ کو
حریمِ جاں میں اُتر شمعِ دلبری لے کر
گذر وفا کے شبستانِ رنگ و نکہت میں
مزاجِ آدمی و شیوۂ پری لے کر

تبسّمِ لبِ ساقی چمن کھلا ہی گیا
نشاطِ فصلِ بہاراں دلوں پہ چھا ہی گیا
کہو حکایتِ گیسو، فسانۂ قدِ یار
شکستِ دار و رسن کا زمانہ آ ہی گیا

نسیمِ صبحِ تصوّر یہ کس طرف سے چلی
کہ میرے دل میں چمن در کنار آتی ہے
کہیں ملے تو مرے گلبدن سے کہہ دینا
ترے خیال سے بوئے بہار آتی ہے

ہوائے صبحِ مشرق جاگ اُٹھی ہے
چمن میں آتشِ گل تیز تر ہے
نگارِ ایشیا ہے گل بداماں
کہ عیدِ شعلۂ و جشنِ شرر ہے

آ تیرے ہونٹ چوم لوں اے مژدۂ نجات
صدیوں کے بعد ختم پہ آئی ستم کی رات
ہر شاخ پر کھلے ہوئے رنگِ شفق کے پھول
ہر نخل کی کمر میں نسیمِ سحر کا ہات

ابھی جوان ہے غم زندگی کا ہر لمحہ
دھڑک رہا ہے دلِ بیقرار کی صورت
حسین و شوخ ہے مستقبلِ بشر کا خیال
کسی تبسمِ بے اختیار کی صورت

سحر ہوئی کہ اُٹھے ظلم کے قدموں سے عوام
سارے گم گشتہ عزیزانِ جہاں مل ہی گئے
لاکھ گلشن میں بچھائے تھے خزاں نے کانٹے
قدمِ بادِ بہار آئے تو گل کھل ہی گئے

ہر ایک خوشی درد کے دامن میں پلی ہے
نسبت ہے ہر اک نغمے کو بسمل کے گلو سے
پیراہنِ گل، دستِ صبا، پنجۂ گلچیں
رنگیں ہے ہر چیز شہیدوں کے لہو سے

اب کسی کو بھی نہیں حوصلۂ تلخیٔ جام
خاک پر بکھرے ہیں ٹوٹے ہوئے شیشوں کے نجوم
واعظِ شہر کو مے خواروں نے مانا ہے امام
خانقاہوں میں ہے رندانِ بلاکش کا ہجوم



جاں نثار اختر

جاں نثار اختر

آمد : گوالیار ۸/فروری ۱۹۱۴ء رخصت : بمبئی ۱۸/اگست ۱۹۷۶ء

جاں نثار نام، اختر تخلص، انتہائی مہذب اور ادب نواز خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ اُن کے والد مضطر خیر آبادی اور تایا بسمل خیر آبادی بھی شاعر تھے۔ اُن کی دادی سعید النساء بیگم حرماں بھی شعر کہتی تھیں۔ اختر نے دسویں جماعت تک تعلیم گوالیار کے وکٹوریہ ہائی اسکول میں حاصل کی اور پھر علی گڑھ سے بی اے آنرز کیا۔ اُردو میں ناول نویسی، پر ڈاکٹریٹ کرنا چاہتے تھے لیکن حالات نے اجازت نہیں دی۔

اُن کی شادی اسرار الحق مجاز کی سگی بہن صفیہ سے ہوئی۔ آزادی کے بعد پھوٹ پڑنے والے فسادات نے جب گوالیار کو بھی لپیٹ میں لے لیا تو وہ بھوپال آ گئے اور حمیدیہ کالج میں صدر شعبۂ اُردو فارسی مقرر ہوئے جہاں صفیہ اختر بھی لیکچرار مقرر ہوئیں۔ ۱۹۴۹ء میں اختر بھوپال سے بمبئی آ گئے اور فلموں میں گیت لکھنے لگے بعد ازاں فلم سازی بھی کی اور مالی مشکلات کا شکار ہوئے۔

جاں نثار کا شاعری کی طرف راغب ہونا فطری عمل تھا۔ دورانِ طالب علمی ہی میں انھوں نے بڑی دلفریب نظمیں لکھیں جن کا لہجہ رومانی تھا۔ ترقی پسند تحریک شعرا میں وہ ایک اہم مقام رکھتے ہیں تاہم اُن کے انقلابی کلام میں وہ گھن گرج اور بلند آہنگی نہیں ملتی جو بیشتر ترقی پسند شعرا کے کلام کا خاصہ ہے۔ درحقیقت اُن کا ادبی وقار اُن کی غزلوں سے قائم ہوا۔ اُن کے سات شعری مجموعے 'سلاسل'، 'تارِ گریباں'، 'نذرِ بتاں'، 'جاوداں'، 'گھر آنگن'، 'خاکِ دل' اور 'پچھلے پہر' شائع ہو چکے ہیں۔ رسالہ 'فن اور شخصیت' جاں نثار اختر پر ایک جامع خاص نمبر اُن کی حیات ہی میں شائع کر چکا ہے۔

'خاکِ دل' پر اختر کو سوویت دیس نہرو ایوارڈ اور بعد از مرگ ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ ملا۔ اُن کی غزلوں میں جسم کی خوشبو، حُسن کی رعنائی اور عشق کی حرارت ہے ؎

ہماری قدر کرو، اے سخن کے متوالو!
غزل کو کل نہ ملیں گے مزاج داں ہم سے

یوں اُس کے حسین عارضوں پر
پلکوں کے لچک رہے ہیں سائے
چھٹکی ہوئی چاندنی میں اختر
جیسے کوئی آڑ میں بلائے

حسن کا عطر، جسم کا صندل
عارضوں کے گلاب، زلف کا عود
بعض اوقات سوچتا ہوں مَیں
ایک خوشبو ہے صرف تیرا وجود

اک ذرا کسمسا کے سوتے میں
کس نے رخ سے اُلٹ دیا آنچل
حُسن کجلا گیا ستاروں کا
بجھ گئی ماہتاب کی مشعل

کتنی معصوم ہیں تیری آنکھیں
بیٹھ جا میرے روبرو، میرے پاس
ایک لمحے کو بھول جانے دے
اپنے اک اک گناہ کا احساس

چند لمحوں کو تیرے آنے سے
تپشِ دل نے کیا سکوں پایا
دھوپ میں گرم کوہساروں کی
ابر کا جیسے دوڑتا سایا

ابر میں چھپ گیا ہے آدھا چاند
چاندنی چھن رہی ہے شاخوں سے
جیسے کھڑکی کا ایک پٹ کھولے
جھانکتا ہو کوئی سلاخوں سے

رات جب بھیگ کے لہراتی ہے
چاندنی اوس میں بس جاتی ہے
اپنی ہر سانس سے مجھ کو اختر
اُن کے ہونٹوں کی مہک آتی ہے

تیرے ماتھے پہ یہ نمودِ شفق
تیرے عارض پہ یہ شگفتہ گلاب
رنگِ جامِ شراب پر مت جا
یہ تو شرما گئی ہے تجھ سے شراب

اس حسیں جام میں ہیں غلطیدہ
کتنے نازک تخیلات کے موڑ
کتنے گُل آفریں لبوں کا رس
کتنے رنگین آنچلوں کا نچوڑ

دوست! کیا حُسن کے مقابل میں
عشق کی جیت سُن سکے گی تو
دلِ نازک سے پہلے پوچھ تو لے
کیا مرے گیت سُن سکے گی تو

یادِ ماضی میں یوں خیال ترا
ڈال دیتا ہے دل میں اک ہلچل
دوڑتے میں کسی حسینہ کا
جیسے آ جائے پاؤں میں آنچل

یوں ہی بدلا ہوا سا اک انداز
یوں ہی روٹھی ہوئی سی ایک نظر
عمر بھر میں نے تجھ پہ ناز کیا
تو کسی دن تو ناز کر مجھ پر

صَرفِ تسکیں ہے دستِ ناز ترا
کم نہیں شورشِ جگر پھر بھی
میری آنکھوں کے رو برو ہے تو
ڈھونڈھتی ہے تجھے نظر پھر بھی

آج مدت کے بعد ہونٹوں پر
ایک مبہم سا گیت آیا ہے
اِس کو نغمہ تو کہہ نہیں سکتا
یہ تو نغمے کا ایک سایا ہے

اپنے آئینۂ تمنّا میں
اب بھی مجھ کو سنوارتی ہے تو
میں بہت دُور جا چکا لیکن
مجھ کو اب تک پکارتی ہے تو

آ کہ اِن بدگمانیوں کی قسم
بھول جائیں غلط سلط باتیں
آ کسی دن کے انتظار میں دوست
کاٹ دیں جاگ جاگ کر راتیں

کر چکی ہے مری محبّت کیا
تیری بے اعتنائیوں کو معاف
عقل نے پوچھنا بہت چاہا
کہہ سکا دل نہ کچھ بھی تیرے خلاف

تتلی کوئی بے طرح بھٹک کر
پھر پھول کی سمت اڑ رہی ہے
پھر پھر کے مگر تری ہی جانب
اُس دل کی نگاہ مڑ رہی ہے

یوں دل کے فضا میں کھیلتے ہیں
رہ رہ کے امید کے اُجالے
چھپ چھپ کے کوئی شریر لڑکی
آئینے کا عکس جیسے ڈالے

انگڑائی یہ کس نے لی ادا سے
کیسی یہ کرن فضا میں پھوٹی
کیوں رنگ برس پڑا چمن میں
کیا قوسِ قزح لچک کے ٹوٹی

ایک کم سن حسین لڑکی کا
اس طرح فکر سے ہے مکھڑا ماند
جیسے دھندلی کہر چنبیلی پر
جیسے ہلکی گھٹا کے اندر چاند

نامرادی کے بعد بے طلبی
اب ہے ایسا سکون جینے میں
جیسے دریا میں ہاتھ لٹکائے
سو گیا ہو کوئی سفینے میں

یوں ندی میں غروب کے ہنگام
جگمگائی شفق فروز کرن
چلتے چلتے بھی آئینہ دیکھے
جیسے کوئی سجی سجائی دلہن

دُور وادی میں یہ ندی اخترؔ
کتنے میٹھے سروں میں گاتی ہے
صبح کے اِس حسین دھندلکے میں
کیا یہیں بھیرویں نہاتی ہے

مَیں نے مانا تری محبّت میں
دل کے دل ہی میں رہ گئے ارمان
پھر بھی اس بات کا یقیں ہے مجھے
نامکمّل نہیں مرا رومان

ہائے یہ تیرے ہجر کا عالم
کس قدر زرد ہے حسیں مہتاب
اور یہ مست آبشار کی لے
کوئی روتا ہو جیسے پی کے شراب

اُف یہ امید و بیم کا عالم
کون سے دن منڈھے چڑھے گی بیل
ہائے یہ انتظار کے لمحے
جیسے سگنل پہ رُک گئی ہو ریل

اِک نئی نظم کہہ رہا ہوں مَیں
اپنے جذبات کی حسیں تفسیر
کس محبّت سے تک رہی ہے مجھے
دور رکھی ہوئی تری تصویر

کس کو معلوم تھا کہ عہدِ وفا
اس قدر جلد ٹوٹ جائے گا
کیا خبر تھی کہ ہاتھ لگتے ہی
پھول کا رنگ چھوٹ جائے گا

دوست! تجھ سے اگر خفا ہوں تو کیا
آپ سے بھی تو خود خفا ہوں مَیں
آج تک یہ نہ کھُل سکا مجھ پر
بے وفا ہوں کہ با وفا ہوں مَیں



احمد ندیم قاسمی

احمد ندیم قاسمی

آمد ، قصبہ رنگا (ضلع شاہ پور) مشرقی پنجاب ۲۰/ نومبر ۱۹۱۶ء

اصلی نام پیرزادہ احمد شاہ۔ ابتدائی زندگی تنگدستی اور متصوفانہ خودداری سے ثابت قدمی کے ساتھ گزاری۔ پنجاب یونیورسٹی سے بی اے کیا۔ محکمۂ ایکسائز میں انسپکٹر رہے۔ متعدد ادبی رسائل اور اخبارات کے مدیر رہ چکے ہیں۔ آج کل مجلسِ ترقی ادب لاہور کے ناظمِ اعلیٰ اور ادبی مجلّہ "فنون" کے مدیر ہیں۔

احمد ندیم قاسمی کا شمار برصغیر پاک و ہند کے نامور شاعروں، افسانہ نگاروں اور صحافیوں میں ہوتا ہے۔ وہ سماجی اور سیاسی نقطۂ نظر سے ترقی پسند، اخلاقی اعتبار سے وضعدار اور بنیادی طور پر شاعر مزاج ہیں۔

اُن کی چند تصانیف یہ ہیں۔ دھڑکنیں، جلال و جمال، رم جھم (قطعات)، شعلۂ گل، دشتِ وفا، محیط، دوام، چوپال، گرداب و سیلاب، آنچل، آبلے، آس پاس، طلوع و غروب، کپاس کے پھول (افسانے)، در و دیوار، بازارِ حیات اور تہذیب و فن (مضامین) وغیرہ۔

ترقی پسند تحریک سے وابستہ کوئی بھی تخلیق کار نظم و نثر کے میدانوں میں یکساں طور پر اتنا بلند ثابت نہیں ہو سکا جتنا احمد ندیم قاسمی ثابت ہوئے۔ وہ جتنے بڑے شاعر ہیں اتنے ہی بڑے افسانہ نگار بھی ہیں۔ اِس بات کی سند یہ ہے کہ اُن کے ایک مشہور افسانے "ہیروشیما سے پہلے اور ہیروشیما کے بعد" کی مدح سرائی اُن ناقدوں نے بھی کی ہے جنھیں ترقی پسند ادب سے خدا واسطے کا بیر ہے۔

اُن کے قطعات کے مجموعے "رم جھم" نے انھیں برصغیر ہند میں شہرت کی دہلیز پر لا کھڑا کیا ہے

عمر بھر سنگ زنی کرتے رہے لوگ، مگر
یہ الگ بات ہے دفنائیں گے اعزاز کے ساتھ

جب چٹانوں سے پٹتا ہے سمندر کا شباب
دور تک موج کے رونے کی صدا آتی ہے
یک بیک پھر یہی ٹوٹی ہوئی بکھری ہوئی موج
اک نئی موج میں ڈھلنے کو پلٹ جاتی ہے

تمتماتے ہیں سلگتے ہوئے رخسار ترے
آنکھ بھر کر کوئی دیکھے گا تو جل جائے گا
اتنا سیّال ہے یہ پل کہ گماں ہوتا ہے
مَیں ترے جسم کو چھو لوں تو پگھل جائے گا

ذکرِ مریخ و مشتری کے ساتھ
اپنی دھرتی کی بات بھی تو کرو
موت کا احترام برحق ہے
احترامِ حیات بھی تو کرو

آنسوؤں میں بھگو کے آنکھوں کو
دیکھتے ہو تو خاک دیکھو گے
آئینے کو ذرا سا نم کر دو
پیرہن چاک چاک دیکھو گے

حکمتِ اہلِ مدرسہ کا غرور
میری وحشت سے دب کے ہار گیا
تیرا گھبرا کے مسکرا دینا
زندگی کی نقاب اتار گیا

رنگ جب اپنی حقیقت سے شناسا ہو جائے
لالہ زاروں میں بھڑکتا ہے الاؤ بن کر
رقص جب دائرۂ فن سے اُبل پڑتا ہے
دندناتا ہے سمندر کا بہاؤ بن کر

ریشۂ گُل کو رگِ سنگ بنانے والو
بوئے گُل، سنگ سے ٹپکے گی شرارے بن کر
تم کو معلوم تو ہوگا کہ اُجالا دن کا
سینۂ شب میں دھڑکتا ہے ستارے بن کر

ممکن ہے فضاؤں سے خلاؤں کے جہاں تک
جو کچھ بھی ہو آدم کا نشانِ کفِ پا ہو
ممکن ہے کہ جنّت کی بلندی سے اُتر کر
انسان کی عظمت میں اضافہ ہی ہوا ہو

مری شکست پہ اک پرتوِ جمال تو ہے
میں کیوں نہ عظمتِ افتادگی پہ اتراؤں
تجھی سے ہے مری آسودہ خاطری کا بھرم
ترے غموں کا خزانہ چھنے تو لٹ جاؤں

رنگِ حرف صدا کی دنیا میں
زندگی قتل ہوگئی ہے کہیں
مرگیا لفظ ، اُڑ گیا مفہوم
اور آواز کھو گئی ہے کہیں

کُنجِ زنداں میں پڑا سوچتا ہوں
کتنا دلچسپ نظارا ہوگا
یہ سلاخوں میں چمکتا ہوا چاند
تیرے آنگن میں بھی نکلا ہوگا

داورِ حشر مجھے تیری قسم
عمر بھر میں نے عبادت کی ہے
تو مرا نامۂ اعمال تو دیکھ
مَیں نے انساں سے محبت کی ہے

آنکھ کھُل جاتی ہے جب رات کو سوتے سوتے
کتنی سونی نظر آتی ہے گذرگاہِ حیات
ذہن و وجدان میں یوں فاصلے تن جاتے ہیں
شام کی بات بھی لگتی ہے بہت دور کی بات

گلوں میں رنگ تو تھا، رنگ میں جلن تو نہ تھی
مہک میں کیف تو تھا، کیف میں جنوں تو نہ تھا
بدل دیا ترے غم نے بہار کا کردار
کہ اب سے قبل چمن کا مزاج یوں تو نہ تھا

اپنی آواز کی لرزش پہ تو قابو پالو
پیار کے بول تو ہونٹوں سے نکل جاتے ہیں
اپنے تیور بھی سنبھالو کہ کوئی یہ نہ کہے
دل بدلتے ہیں تو چہرے بھی بدل جاتے ہیں

جیسے ہر شعر پہ دیتے تھے تم داد
وہی رنگیں نوا خونیں نوا ہے
اب ان رنگوں کے نیچے دھیرے دھیرے
لہو کا ایک دریا بہہ رہا ہے

وہ پانی بھرنے چلی اِک جوان پنساری
وہ گورے ٹخنوں پہ پازیب چھنچھناتی ہے
غضب غضب کہ مرے دل کی سرد راکھ سے پھر
کسی کی تپتی جوانی کی آنچ آتی ہے

بات کہنے کا جو ڈھب ہو تو ہزاروں باتیں
ایک ہی بات میں کہہ جاتے ہیں کہنے والے
لیکن ان کے لئے ہر لفظ کا مفہوم ہے ایک
کتنے بے درد ہیں اس شہر کے رہنے والے

گلی کے موڑ پہ بچوں کے ایک جمگھٹ میں
کسی نے درد بھری لے میں ماہیا گایا
مجھے کسی سے محبت نہیں مگر اے دل
یہ کیا ہوا کہ تو بے اختیار بھر آیا

وہ دُور جھیل کے پانی میں تیرتا ہے چاند
پہاڑیوں کے اندھیروں پہ نور چھانے لگا
وہ ایک کھوہ میں اک بد نصیب چرواہا
بھگو کے آنسوؤں میں ایک گیت گانے لگا

اداس چاند نے بدلی کی آڑ میں ہو کر
کنارے ملگجے بادل کے کر دیئے روشن
شبِ فراق میں جیسے تصورِ رخِ دوست
دلِ حزیں کے اندھیرے میں روشنی کی کرن

برس کے چھٹ گئے بادل ہوائیں گاتی ہیں
گرجتے نالوں میں چرواہیاں نہاتی ہیں
وہ نیلی دھوئی ہوئی گھاٹیوں سے دو گونجیں
کسی کو دکھ بھری آواز میں بلاتی ہیں

وہ سبز کھیت کے اس پار، ایک چٹان کے پاس
کڑکتی دھوپ میں بیٹھی ہے ایک چرواہی
پرے چٹان سے پگڈنڈیوں کے جالوں میں
بھٹکتا پھرتا ہے وہ ایک نوجواں راہی

یہ اوڑھنی ہے، وہ جھمکے ہیں اور یہ مالا ہے
وہ یاسمن ہے یہ گیندا ہے اور وہ لالہ ہے
اور اُن کے ساتھ شفق رنگ ہیں دو چار
جنہیں فراق نے پالا ہے، غم نے ڈھالا ہے

کئی برس سے ہے ویران مرغزارِ شباب
اب التفات کے بادل برس رہے ہیں کیوں؟
یہ بوندیاں، یہ پھواریں، یہ رس بھرے جھونکے
توقعات کی نعشوں کو ڈس رہے ہیں کیوں؟

...بھی نہ پلٹے گی بیتی ہوئی گھڑی لیکن
...ذرات سے دل خوش ہیں نوعِ انساں کے
...کس کے ہاتھ کے ہیں منتظر خدا جانے
...زتے رہتے ہیں پردے حریمِ جاناں کے

یہ بھی کیا چال ہے ہر گام پہ محشر کا گماں
پائلیں بجتی ہیں، لہنگے کی کماں تنتی ہے
یوں چلو جیسے اترتی ہے کہستاں سے ہوا
جیسے رنگوں کے تموّج سے کرن بنتی ہے

...وشِ جمیل پہ کیوں ڈر دیئے لگا بجرہ
...ائیں تُند نہیں ہیں کنارہ دور نہیں
...خور کا ذکر نہ کر، زندگی کا لطف نہ چھین
...ے ابھی کسی انجام کا شعور نہیں

یوں مرے ذہن میں لرزاں ہے ترا عکس جمیل
دلِ مایوس میں یوں گاہے اُبھرتی ہے آس
ٹمٹماتا ہے وہ نوخیز ستارا جیسے دُور مسجد کے اُس اُبھرے ہوئے مینار کے پاس

تری زلفیں ہیں کہ ساون کی گھٹا چھائی ہے
تیرے عارض ہیں کہ پھولوں کو ہنسی آئی ہے
یہ تیرا جسم ہے یا صبح کی شہزادی ہے
ظلمتِ شب سے اُلجھی ہوئی انگڑائی ہے

بلھدھ پہ یہ گاتا ہوا کون آنکلا
اں گاگریں بھرتی ہوئی گھبرا سی گئیں
نی سر پہ جما کر وہ صبوحی اٹھی
زیاں چار ہوئیں جھک گئیں شرما سی گئیں

پو پھٹتے رینگتے جھرنے پہ یہ کون آیا ہے
بال بکھرے ہوئے لپٹے ہوئے خواب آنکھوں سے
لوٹ لیں تشنگیٔ زیست نے نیندیں ورنہ
یوں پیا لے نہ برستی مئے ناب آنکھوں سے

نے اس دشت کی وسعت میں شبستاں پائے
کے ٹیلوں پہ مجھے قصر نظر آئے ہیں
ولوں میں کسی ساز کے پردے لرزے
مجوروں پہ مرے راز ابھر آئے ہیں

بوڑھے ماں باپ بلکتے ہوئے گھر کو پلٹے
چونک اٹھے ہیں وہ شہنائی بجانے والے
اُف بچھڑتی ہوئی دوشیزہ کے نالوں کا اثر
ڈولتے جاتے ہیں ڈولی کے اٹھانے والے

رخسار ہیں یا عکس ہے برگِ گلِ تر کا
چاندی کا یہ جھومر ہے کہ تارا ہے سحر کا
یہ آپ ہیں یا شعبدۂ خوابِ جوانی
یہ رات حقیقت ہے کہ دھوکا ہے نظر کا

ساون کی یہ رُت اور یہ جھولوں کی قطاریں
اُڑتی ہوئی زلفوں پہ مچلتی ہیں پھواریں
میں صبح سے ندی کے کنارے پہ کھڑا ہوں
ملّاح کہاں ہیں جو مجھے پار اُتاریں

وہ تار کے اک کھمبے پہ بیٹھی ہے ابابیل
اُڑنے کے لئے دیر سے پَر تول رہی ہے
جس طرح مرے عشق کی ٹوٹی ہوئی کشتی
اُمید کے ساحل پہ کھڑی ڈول رہی ہے

گرتی ہوئی بوندیں ہیں کہ پارے کی لکیریں
بادل ہے کہ بستی پہ گجر دم کا دھواں ہے
مغموم پپیہا ہے کہ بھٹکا ہوا شاعر
جو پوچھتا پھرتا ہے کہاں ہے تو کہاں ہے

یہ فضا، یہ گھاٹیاں، یہ بدلیاں، یہ بوندیاں
کاش اُس بھیگے ہوئے پربت سے لہراتی ہوئی
دھیرے دھیرے ناچتی آئے صبوحی اور پھر
گھُل کے کھو جائے کہیں میری غزل گاتی ہوئی

باجرے کی فصل سے چڑیاں اُڑانے کے لئے
ایک دوشیزہ کھڑی ہے کنکروں کے ڈھیر پر
وہ جھکی وہ ایک پتھّر سنسنایا، وہ وہ گرا
کٹ گئے ہیں اُس کے جھٹکے سے مرے قلب و جگر

عید کا دن ہے فضا میں گونجتے ہیں قہقہے
جھولتی ہیں لڑکیاں جھولوں پہ گاتی ہیں ملہار
میرا جھولا جس سے ہیں لپٹے ہوئے سرسوں کے پھول
دیکھتا ہے ایک نکڑ کو لپک کر بار بار

گورے ہاتھوں میں یہ دھانی چوڑیوں کی آن بان
کالی زلفوں پر گلابی اوڑھنی کی آب و تاب
ہر قدم پر نقرئی خلخال کے نغموں کی لہر
تیرے پیکر میں مجسم ہوگئی روحِ شباب

گائیں ڈکراتی ہوئی پگڈنڈیوں پر آگئیں
مرلیاں ہاتھوں میں لے کر مست چرواہے بڑھے
بیریوں کے دھندلے سایوں میں کھڑا ہوں منتظر
ایک لڑکی کو گزرنا ہے یہاں سے دن چڑھے

کھڑکھڑاتی ڈول وہ دھم سے کنویں میں گر گئی
دم بخود پنہاریاں کنگن گھماتی رہ گئیں
وہ کنویں میں ایک چرواہا اترنے کو بڑھا
وہ صبوحی کی نگاہیں مسکراتی رہ گئیں

لڑکیاں چنتی ہیں گیہوں کی سنہری بالیاں
کاٹتے ہیں گھاس مینڈھوں پر سے بانکے نوجواں
کھوئی کھوئی ایک لڑکی بیریوں کی چھاؤں میں
دیکھتی ہے گھاس پر لیٹی ہوئی جانے کہاں

بج رہی ہیں ہولے ہولے کارواں کی گھنٹیاں
رینگتی جاتی ہے صحراؤں میں اونٹوں کی قطار
ایک دوشیزہ کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں
دیکھتی ہے جانے کیوں سوئے اُفق دیوانہ وار

گونج ہے شہنائیوں کی دھوم ہے باراتی کی
پھر رہی ہیں کھیلتی، ہنستی، مچلتی کنواریاں
گاؤں سے کچھ دور اک سنسان گورستاں میں
ہو رہی ہیں ایک سادہ قبر کی تیاریاں

رَن میں جانے کے لئے تیار بیٹھے ہیں جواں
گردنیں اکڑی ہوئی رخ پر جوانی کی بہار
ایک جانب دم بہ خود استادہ ہیں کچھ لڑکیاں
اپنی آنکھوں میں چھپائے آنسوؤں کے آبشار

دیکھ رہی تو ہنگھٹ پر جا کر میرا ذکر نہ چھیڑا کر
مَیں کیا جانوں کیسے ہیں وہ کس کوچے میں رہتے ہیں
مَیں نے کب تعریفیں کی ہیں اُن کے بانکے نینوں کی
وہ اچھے خوش پوش جواں ہیں میرے بھیّا کہتے ہیں

سِسکتے چاند نے بادل میں چھُپ کر
بُنا ہے نقرئی کرنوں کا جالا
حسیں بیمار کے چہرے پہ جیسے
کسی بے نام تابانی کا ہالا

۱

لمتہ مقبروں میں ٹوٹتی راتوں کو اک لڑکی
ے ہاتھوں میں بربط، جوگ میں کچھ گنگناتی ہے
ہا کرتے ہیں جو اسے کہ جب رکتے ہیں گیت اُسکے
اک تازہ لحد سے چیخ کی آواز آتی ہے

صاف کھلیان پہ غلّے کا سنہری انبار
چار سو بیٹھے ہیں دہقان تھکے ہارے سے
ڈوبتے چاند کے ہالے میں ہوں جیسے تارے
روئے روئے سے پریشان سے بیچارے سے

سن محوِ خواب کے سیلاب میں
ند پلکوں سے ٹپک کر بہہ گئی
نے جب آنکھیں ملیں انگڑائی لی
ندگی اک خواب بن کر رہ گئی

دوپہر، لُو، غبار، خاموشی
تنکے یوں اڑ رہے ہیں گلیوں میں
جیسے مرحوم باپ کی دولت
نوجوانوں کی رنگ رلیوں میں

کتنے سلجھے ہوئے صیّاد ہو سبحان اللہ
قفسِ سنگ میں کمخواب بچھا دیتے ہو
جب مجھے بھوک ستاتی ہے تو کتنے ڈھب سے
تھپکیاں دیتے ہو، گاکے ہو سلا دیتے ہو

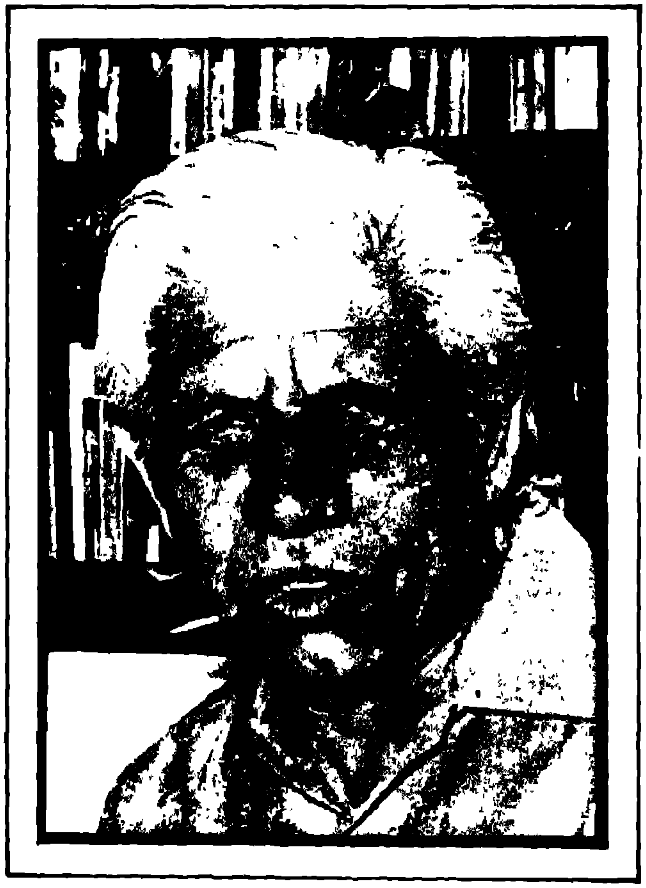
مشرق کو اگر شدتِ احساس نے مارا
مغرب کو غمِ دگوہر والماس نے مارا
لیکن مرے مہتاب جبیں ہم وطنوں کو
محکومی و بے کاری وافلاس نے مارا

دو بیگھے زمیں کاشت کی خاطر مجھے دے کر
تم کرتے ہو چھپ کر مری لڑکی کو اشارا
محنت تو بکا کرتی ۔ ہے غیرت نہیں بکتی
افلاس کا مارا ہوا دہقان پکارا

افق سے اک گھٹا اٹھی گرجتی ، گونجتی گاتی
گذر کر میرے ویراں کھیت پر سے دور جا برسی
کچھ ایسے میں نے دیکھا اس کی جانب جس طرح مفلس
امیروں کی نگاہِ تند میں ڈھونڈے خدا ترسی

بادشاہوں کی معطر خواب گاہوں میں کہاں
وہ مزا جو بھیگی بھیگی گھاس پر سونے میں ہے
مطمئن لوگوں کی اُجلی مسکراہٹ میں کہاں
لطف جو اک دوسرے کو دیکھ کر رونے میں ہے

نہیں بے مدعا تخلیقِ انساں
سمجھ میں مدعا لیکن نہ آیا
خدا خالق سہی ، مخلوق کے پاس
رسول آئے ، خدا اب تک نہ آیا



کشمیری لال ذاکر

کشمیری لال ذاکر

آمد : بیگا بانیاں، ضلع گجرات (پاکستان) ۷/اپریل ۱۹۱۹ء

کشمیری لال نام، ذاکر تخلص۔ پنجاب یونیورسٹی سے انگریزی میں ایم اے کیا۔ ملازمت کی شروعات سرکل سوشل ایجوکیشن آفیسر برائے روہتک اور انبالہ کے عہدے سے کی۔ پنجاب اور ہریانہ کے محکمۂ تعلیم میں کئی اہم عہدوں پر فائز رہے۔ فی الوقت ہریانہ اُردو اکیڈمی کے سکریٹری ہیں۔

ذاکر کی ادبی شہرت اُن کے افسانوں اور ناولوں کی وجہ سے ہے۔ اُن کا پہلا افسانہ 'الگ الگ راستے' ۱۹۴۴ء میں 'ہمایوں' میں شائع ہوا تھا۔ کہانیوں کا پہلا مجموعہ 'جب کشمیر جل رہا تھا' ۱۹۴۸ء میں شائع ہوا جس میں شمولہ تمام کہانیاں کشمیر سے متعلق ہیں۔ ۱۹۵۲ء میں مکتبۂ شاہراہ نے ان کا ایک ناولٹ 'سیندور کی راکھ' شائع کیا جو خاصا مقبول ہوا اور انکی ادبی ساکھ بن گئی۔

ذاکر نے اب تک تقریباً اسّی کتابیں تصنیف کی ہیں۔ جن میں ناول، افسانے، ڈرامے، شاعری، تعلیمی کتابیں اور سفرنامے شامل ہیں۔ ذاکر کو ان کی تصانیف پر حکومتِ ہند اور مختلف ریاستی اکیڈمیوں اور اداروں کی جانب سے کئی انعامات و اعزازات مل چکے ہیں۔ رسالہ 'فن اور شخصیت' ان کی پچاس سالہ ادبی خدمات پر ایک ضخیم خاص نمبر شائع کر چکا ہے۔ جس میں اُن کی شخصیت اور فن کا مکمل اور جامع جائزہ لیا گیا ہے۔

ذاکر نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز شاعری سے کیا تھا لیکن بعد میں انھوں نے فکشن پر زیادہ توجہ دی۔ اُن کے افسانوں اور ناولوں کی زبان پر کرشن چندر کی طرزِ تحریر کی چھاپ نظر آتی ہے۔ بلونت سنگھ انھیں اُردو افسانے کا میر تقی میر کہا کرتے تھے۔ شاعری میں گو کہ وہ نظریاتی اعتبار سے ترقی پسند تحریک سے قریب رہے ہیں لیکن ان کی شعری تخلیقات میں کلاسیکی رچاؤ اور روایتی انداز نمایاں ہے ؎

میری غزلیں، میرے فسانے اُس کے ہیں
آپ نے جو کچھ سمجھا ہے سب اُس کا ہے

گلُوں کا، نغموں کا، خوابوں کا چاندنی کا سلام
کھُلی فضاؤں کا، خوشبو کا روشنی کا سلام
گلی گلی کا یہ جوگی، نگر نگر کا فقیر
تمہارے شہر میں لایا ہے زندگی کا سلام

ہم فقیروں کی بات کیوں پوچھو
روز مرتے ہیں، روز جیتے ہیں
اِک نیا زخم دن کو ملتا ہے
اِک نیا زخم شب کو سیتے ہیں

آرزو کے دیئے جلانے سے
یہ اندھیرے تو کم نہیں ہوں گے
کب زمانے میں غم نہیں تھے دوست
کم زمانے میں غم نہیں ہوں گے

تو مرے ساتھ اب نہیں ہے دوست
چاندنی کس لئے ترستی ہے
جام اب کیوں کھنکتے رہتے ہیں
یہ گھٹا کس لئے برستی ہے

مری گلی میں، یہ آہٹ تھی کس کے قدموں کی
یہ کون، چاند سے دامن بچا کے گذرا ہے
مرے اُداس دریچے، مجھے بتاتے ہیں
بڑے ہی درد سے، کوئی بُلا کے گذرا ہے

زندگی کی حسین شہزادی
آرزو کے ستم سے ڈرتی ہے
پھر بھی ہر روز اپنے خاکوں میں
آرزوؤں کے رنگ بھرتی ہے

اِتنی تلخ فضا میں بھی ہم زندہ ہیں
اپنے درد کے سُورج سے تابندہ ہیں
ڈھلتی رات کے تارے ہیں ہم صحرا میں
سچ پوچھو تو خود سے بھی شرمندہ ہیں

تم گناہوں سے ڈر کے جیتے ہو
ہم اِنھیں ساتھ لے کے چلتے ہیں
یہ وہ راہبر ہیں، جن کے ہاتھوں سے
جنّتوں کے چراغ جلتے ہیں

تم گھٹاؤں کا اہتمام کرو
اِذنِ جام شراب ہم دیں گے
تم گناہوں کا لُطف تو لے لو
حشر کے دِن حساب ہم دیں گے

آسماں کی بلندیوں سے ندیم
ایک روشن ستارہ ٹوٹ گیا
میرے ہاتھوں سے جامِ مستقبل
فرشِ ماضی پہ گر کے چھوٹ گیا

مِری جوانی بہاروں میں بھی اُداس رہی
فضائے دردِ تمنا کو راس آ نہ سکی
خوشی اُفق پہ کھڑی دیکھتی رہی مجھ کو
اُسے بُلا نہ سکا، خود وہ پاس آ نہ سکی

سخت جاں بھی ہیں اور نازُک بھی
درد کے باوجود جیتے ہیں
زندگی زہر ہے، مگر ہم لوگ
چھان کر گیسوؤں میں پیتے ہیں

دِل جلوں کو ستانے آئے ہیں
غم زدوں کو رُلانے آئے ہیں
اُف! یہ بے دردِ شام کے سائے
حسرتوں کو جگانے آئے ہیں

درد کا جام لے کے جیتے ہیں
ضبط سے کام لے کے جیتے ہیں
لوگ جیتے ہیں سو بہانوں سے
ہم تِرا نام لے کے جیتے ہیں

آ کہ بزمِ طرب سجا لیں ہم
آ کہ عشرت کا گیت گا لیں ہم
زندگی عُمر بھر کا رونا ہے
آ کہ پل بھر کو مُسکرا لیں ہم

کاوشِ صبح و شام باقی ہے
ایک دردِ مُدام باقی ہے
سجدے کرتا ہوں اُٹھ کے پچھلے پہر
عشق کا احترام باقی ہے

بڑی شفیق، بڑی غم شناس لگتی ہیں
تمھارے شہر کی گلیاں اُداس لگتی ہیں
وہ درد مند نگاہیں، جو چھن گئیں مجھ سے
کبھی کبھی تو مجھے آس پاس لگتی ہیں

تمھاری یاد کے اُجڑے ہوئے، اُداس چمن
نکھر رہے ہیں، مرے درد کی پھُوار کے ساتھ
میں سوچتا ہوں، کبھی تم بھی لوٹ آؤ گے
تمھارا بھی تو تعلق ہے، کچھ بہار کے ساتھ

نہ تیرے درد کے تارے ہی اب سُلگتے ہیں
نہ تیری یاد کی اب چاندنی برستی ہے
یہ کیسا وقت، محبت میں تیری آیا ہے
مری حیات، ترے غم کو بھی ترستی ہے

اے غمِ دوست، ہم نے تیرے لئے
کتنے ہونٹوں کے جام توڑے ہیں
کتنی زُلفوں کے سائے ملتے تھے
کتنی زُلفوں کے سائے چھوڑے ہیں



قتیل شفائی

قتیل شفائی

آمد: ہری پور، ہزارہ، صوبہ سرحد ۲۴/ دسمبر ۱۹۱۹ء

اورنگ زیب خاں نام، قتیل تخلص۔ ایک متمول خاندان میں پیدا ہوئے۔ اسکول تک کی تعلیم گورنمنٹ ہائی اسکول ہری پور، ہزارہ میں حاصل کی۔ عملی زندگی میں قدم رکھا تو 'ادبِ لطیف' لاہور اور 'سنگِ میل' پشاور جیسے ادبی جریدوں کی ادارت کے فرائض انجام دینے لگے۔ پھر پاکستان کی فلم انڈسٹری سے بحیثیت نغمہ نگار وابستہ ہو گئے اور آج تک وابستہ ہیں۔

قتیل کا شمار اُردو کے مقبول ترین شعراء میں ہوتا ہے۔ اُن کے کلام کے کئی مجموعے شائع ہو کر عوام و خواص میں مقبولیت حاصل کر چکے ہیں۔ اُن کے کلام کا زیادہ تر حصّہ غزلوں، گیتوں اور نظموں پر مشتمل ہے۔ موسیقیت اور نغمگی قتیل کے کلام کی نمایاں خصوصیات ہیں۔

قتیل نے ترقی پسند تحریک کے عروج کے زمانے میں شاعری شروع کی پھر بھی اپنے کلام کو خطیبانہ لہجے اور نعرہ بازی سے بچائے رکھا۔

قتیل کے 'ہریالی' سے 'سمندر کی سیڑھی' تک چودہ شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں اور ان پر مشتمل کلیات 'رنگ، خوشبو اور روشنی (تین جلدیں) اور تمام تر کلام سے منتخبہ مجموعہ 'انتخاب' شائع ہو چکا ہے۔ رسالہ 'فن اور شخصیت' قتیل شفائی پر ایک جامع خاص نمبر شائع کر چکا ہے۔

قتیل شفائی نے اُردو شاعری کو بہت ہی خوبصورت اور سجیلے گیت عطا کئے ہیں۔ اکثر ناقدین کی رائے ہے کہ حفیظ جالندھری کے بعد قتیل نے ہی اُردو زبان کا دامن اتنے دلفریب گیتوں سے بھرا ہے اور بقول حبیب جالب اُردو شاعری کی تاریخ میں مصحفی کے بعد قتیل نے سب سے زیادہ لکھا ہے۔ بہر حال غزل ہو کہ گیت یا نظم قتیل اپنی نغمگی اور راست طرزِ بیان کی وجہ سے اپنی ایک منفرد شعری پہچان رکھتے ہیں ؎

جب بھی آتا ہے مرا نام ترے نام کے ساتھ
جانے کیوں لوگ مرے نام سے جل جاتے ہیں

لفظ چُنتا ہوں تو مفہوم بدل جاتا ہے
اِک نہ اِک خوف بھی ہے جرأتِ اظہار کے ساتھ
دو گھڑی آ کے مِل آئیں کسی غالب سے قتیل
حضرتِ ذوق تو وابستہ ہیں دربار کے ساتھ

سُرخ آہن پہ ٹپکتی بوند ہے اب ہر خوشی
زندگی نے یوں تو پہلے ہم کو ترسایا نہ تھا
خوب روئے چُھپ کے گھر کی چار دیواری میں ہم
حالِ دل کہنے کے قابل کوئی ہمسایہ نہ تھا

کون اس دیس میں دے گا ہمیں انصاف کی بھیک
جس میں خونخوار درندوں کی شہنشاہی ہے
جس میں غلّے کے نگہباں ہیں وہ گیدڑ جن سے
قحط و افلاس کے بھوتوں نے اماں چاہی ہے

اِک ایسا وقت بھی آتا ہے چاندنی شب میں
مِرا دماغ مِرا دل کہیں نہیں ہوتا
ترا خیال کچھ ایسا نکھر کے آتا ہے
ترا وصال بھی اتنا حسیں نہیں ہوتا

مطمئن کوئی نہیں ہے اس سے
کوئی برہم ہے تو خائف کوئی
نہیں کرتی یہ کسی سے بھی وفا
زندگی ہے کہ طوائف کوئی



ساحر لدھیانوی

ساحر لدھیانوی

آمد: لدھیانہ ۸/مارچ ۱۹۲۱ء رخصت: بمبئی ۲۵/اکتوبر ۱۹۸۰ء

عبدالحیٔ نام، ساحر تخلّص متموّل اور خوشحال جاگیردار گھرانے میں پیدا ہوئے۔ والدہ نے والد سے تعلقات کشیدہ ہو جانے پر علیحدگی اختیار کر لی۔ ساحر نے والدہ اور ماموں کے زیرِ سایہ پرورش پائی۔ اُن کی کم عمری ہی میں وقوع پذیر ہونے والے اس ناگوار واقعہ نے ساحر کو ذہنی اور نفسیاتی طور پر بے حد متاثر کیا اور اُنہیں جاگیردارانہ نظام سے بغاوت پر اُکسایا جس کا اظہار اُن کے کلام میں جا بجا نظر آتا ہے۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد لاہور میں 'ادبِ لطیف' اور 'سویرا' میں بحیثیت مدیر کام کیا۔ تقسیم کے بعد 'شاہراہ' کی ادارت کی۔ پھر بمبئی پہنچے جہاں فلمی دنیا نے اُن کی پذیرائی کی۔

ساحر فلمی دنیا کے سب سے زیادہ باعزّت اور مقبول گیت کار تھے۔ اُن کی شہرت ایسی تھی جیسی فلم اسٹارز یا معزّز سیاسی لیڈروں کو نصیب ہوتی ہے۔ ساحر نے انیس بیس برس کی عمر میں شاعری شروع کی اور تب سے لے کر آج تک اُن کی مقبولیت جوں کی توں برقرار ہے۔ ساحر کا پہلا مجموعۂ کلام 'تلخیاں' اُردو شاعری کے مقبول ترین مجموعوں میں سے ایک ہے۔

ساحر کو ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں ۱۹۷۱ء میں پدم شری اور ۱۹۷۲ء میں سوویٹ لینڈ نہرو ایوارڈ سے نوازا گیا۔ صوبائی اکادمیوں سے بھی کئی انعامات ملے۔ ہند و پاک جنگ کے بعد ۱۹۷۲ء میں چند فوجی چوکیوں کا نام ساحر کے نام پر رکھا گیا۔ سینا سیوا کور پس کا ترانہ بھی ساحر کی تخلیق ہے۔ لدھیانہ کی ایک اہم سڑک کا نام ساحر روڈ رکھا گیا اور حکومتِ پنجاب نے ساحر کلچرل سینٹر قائم کیا۔

رسالہ 'فن اور شخصیت' ساحر پر ایک ضخیم اور جامع خاص نمبر شائع کر چکا ہے۔ ساحر کی تصانیف میں تلخیاں، گاتا جائے بنجارہ، آؤ کہ کوئی خواب بُنیں، آخری نذرانے اور کلیات (زیرِ ترتیب) شامل ہیں۔

ساحر ایک انتہائی حسّاس شاعر تھے۔ اُن کی شاعری اپنے عہد کا مرقع ہے۔ اُن کی نظمیں اپنے وقت کے سیاسی اور سماجی ہیجان کی آئینہ دار ہیں۔ ساحر کی شہرت کا راز اُن کے دلفریب اندازِ بیان اور راست طرزِ تخاطب میں پنہاں ہے اور اِسی خصوصیت نے ساحر کو بحیثیت شاعر ایک اہم مقام عطا کیا ہے ؎

کون جانے یہ ترا شاعرِ آشفتہ مزاج
کتنے مغرور خداؤں کا رقیب آج بھی ہے

ـند کلیاں نشاط کی چن کر
.توں محوِ یاس رہتا ہوں
ِملنا خوشی کی بات سہی
، سے مِل کر اُداس رہتا ہوں

نہ منہ چھپا کے جئے ہم، نہ سر جھکا کے جئے
ستمگروں کی نظر سے نظر مِلا کے جئے
اب ایک رات اگر کم جئے تو کم ہی سہی
یہی بہت ہے کہ ہم مشعلیں جلا کے جئے

، بے رنگیٔ گلزار کہوں تو کیا ہو
ِن ہے کتنا گنہگار کہوں تو کیا ہو
ُ نے جو بات سرِ بزم نہ سننا چاہی
ں وہی بات سرِ دار کہوں تو کیا ہو

تپتے دل پر یوں گرتی ہے
تیری نظر سے پیار کی شبنم
جلتے ہوئے جنگل پر جیسے
برکھا برسے رُک رُک تھم تھم

جہاں جہاں تری نظروں کی اوس ٹپکی ہے
وہاں وہاں سے ابھی تک غبار اُٹھتا ہے
جہاں جہاں ترے جلووں کے پھول بکھرے تھے
وہاں وہاں دلِ وحشی پکار اُٹھتا ہے



دلاور سنگھ

دلاور سنگھ

آمد : دھول کلاں (گجرات۔ پاکستان) ۲۶/دسمبر ۱۹۲۶ء

دلاور سنگھ اردو نام، دلاؔور تخلص، دھول کلاں کے زمیندار گھرانے میں پیدا ہوئے۔ دادا کرم دتّامل ہوتے تھے۔ اُس زمانے میں پنجاب میں رواج تھا کہ ہر گھر کا بڑا لڑکا سکھ بنا دیا جاتا تھا۔ چونکہ سکھ دھرم کا جنم مظلوموں کی حفاظت اور ملک و قوم کے تحفّظ کے لئے ہوا تھا۔ اس لئے اُن کے والد سردار دولت سنگھ، سکھ بنا دیئے گئے۔ دلاور سنگھ کی ابتدائی تعلیم گھر میں اور پھر مقامی اسکول میں ہوئی۔ دس سال کی عمر میں اچانک والد کا انتقال ہو گیا اور بے حد ہونہار طالبِ علم ہونے کے باوجود اُنہیں بارہ سال کی عمر میں کپڑے کا کاروبار شروع کرنا پڑا اور تعلیمی شوق کو جاری رکھتے ہوئے پندرہ سال کی عمر میں انھوں نے پرائیویٹ سے گریجویشن کیا۔

ملک کی تقسیم کے بعد اپنے خاندان کے ساتھ پٹنہ میں آباد ہوئے لیکن ۱۹۵۲ء میں پٹنہ کی موروثی زمینات اور جائداد بیچ کر مستقل طور پر بمبئی کو گھر بنا لیا۔ دلاؔور سنگھ کمال کے بزنس مین ہیں اور متعدد ملکی اور بین الاقوامی کاروبارات سے وابستہ رہ چکے ہیں انھیں انٹرنیشنل ٹریڈنگ سے خاص دلچسپی ہے اور سرکاری پالیسیوں کے مطابق اپنے کاروبار بدلتے رہے ہیں۔ پچاس ساٹھ ممالک کا سفر کر چکے ہیں اور ۳۰ - ۳۵ ممالک سے تجارتی تعلقات ہیں۔ انھوں نے ۱۹۸۴ء میں امریکہ میں این آر آئی کی حیثیت سے قیام کیا اور اپنا ذاتی کاروبار شروع کیا جن میں جواہرات کا بزنس بھی شامل ہے۔ اُن کی دو بڑی کمپنیاں، اردوہ فائبر لمیٹیڈ اور الائیڈ فائبر لمیٹیڈ قائم ہو چکی ہیں اور تیسری کمپنی اردوہ گرینائیڈ لمیٹیڈ جلد ہی قائم ہو گی۔

دلاور سنگھ کو آٹھ سال کی عمر سے ادب و شاعری سے لگاؤ ہے۔ وہ بہت عمدہ شعری ذوق رکھتے ہیں اور اُردو اور پنجابی ادب کا اچھا مطالعہ کیا ہے۔ جاں نثار اختؔر سے اُن کے بہت ہی قریبی تعلقات تھے اور اُن کے ساتھ اکثر گھریلو نشستوں میں بھی حصّہ لیا کرتے تھے۔ غزل سننے کا بھی بہت شوق ہے اور جگجیت سنگھ، مہدی حسن، غلام علی، پنکج اُدھاس اور دیگر تمام اچھے غزل سنگروں کو سُنتے رہتے ہیں۔ پچھلے آٹھ دس سالوں سے باقاعدہ شعر کہہ رہے ہیں اور سفر کے دوران بھی مشقِ سخن جاری رہتی ہے۔ اُن کے کلام میں انفرادیت اور سادگی کے ساتھ ساتھ جذبات کی روانی و شوخی، احساس کی شدت اور رومانی کیفیات ہیں ؎

یوں جیو دوستو زمانے میں
موت بھی پاس آتے گھبرائے

تھوڑی مے نذرِ جام کر دیجے
ہم غریبوں کی شام کر دیجے
اور اُٹھا کر نقاب چہرے سے
بزم میں قتلِ عام کر دیجے

مندروں، مسجدوں کی دُنیا میں
شکل و صورت میں نیک ہوتے ہیں
اور اِس دل کی بات پوُچھو تو
میکدے میں سب ایک ہوتے ہیں

تیرے سر پر جنون ہے پیارے
مستقل بے سکون ہے پیارے
کھیل ہولی، مگر یہ سوچ کے کھیل
آدمی کا یہ خون ہے پیارے

کیف ہی کیف ہے فضاؤں میں
رنگ کیا روپ بھی شرابی ہے
توڑ لینے دو سیب پیڑوں سے
ہاں! طبیعت بڑی گلابی ہے

دِل کی محفل کو سجایا ہے بڑی دیر کے بعد
اپنے زخموں کو ہنسایا ہے بڑی دیر کے بعد
تم بھی آجاؤ کہ ہر شے پہ بہار آئی ہے
آج پھر تم کو بُلایا ہے بڑی دیر کے بعد



نریش کمار شاد

نریش کمار شاد

آمد: یکی پور (ضلع ہوشیارپور) ۱۱/دسمبر ۱۹۲۷ء
رخصت: دہلی ۲۰/مئی ۱۹۶۹ء

نریش کمار نام، شاد تخلص۔ یکی پور ضلع ہوشیارپور میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد ہر یارام بھی شاعر تھے اور درد تخلص کرتے تھے۔ بلا نوش تھے اس لئے بچّوں کی تربیت سے غفلت برتی۔ شاد کا بچپن بڑی عسرت، محرومی اور ناشادگی میں گزرا۔ جیسے تیسے دسویں تک تعلیم حاصل کی اور کم عمری میں ہی ملازمت پیشہ ہوگئے لیکن دنیادی مسائل اور معاشی مشکلات نے کبھی شاد کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ انھوں نے غمِ دوراں کا علاج مے نوشی میں تلاش کرنا چاہا۔ والد کی طرح شاد بھی بلانوش ہوگئے۔ صحت گرتی گئی اور کئی بار موت کے مُنہ سے بچے۔ گھریلو زندگی تلخ سے تلخ ہوتی چلی گئی۔ شاد ذہنی اور جسمانی طور پر اس قابل نہیں رہے کہ حوصلہ مندی سے مسائل کا مقابلہ کر پاتے۔ انھوں نے تنگ آکر خودکشی کر لی۔

شاد کو شاعری کا شوق کم عمری ہی سے تھا۔ انھوں نے نثر اور نظم میں چالیس سے زیادہ کتابیں تصنیف کیں۔ شاد کی شاعری غمِ دوراں اور غمِ جاناں کے امتزاجی اظہار کا نمونہ ہے۔ وہ اپنی ذاتی زندگی کے حالات سے مجبور تو تھے ہی ساتھ ہی دل کے ہاتھوں بھی مجبور تھے۔ انھیں فنِ شعر پر دسترس حاصل تھی۔ اُن کا کلام پُرتاثیر اور کیف انگیز ہے۔

شاد نے مختلف اصنافِ شاعری کو برتا ہے۔ لیکن اُن کی شہرت اور اہمیت ان کے قطعات کی وجہ سے ہے۔ اُن کے قطعات کا مجموعہ 'قاشیں' اُردو شاعری کی ایک قابلِ قدر کتاب ہے اور شاد کو بحیثیت شاعر زندہ رکھنے کے لئے کافی ہے ؎

پتی پتی گلاب ہو جاتی — ہر کلی محوِ خواب ہو جاتی
تو نے ڈالی نہ مہرفشاں نظریں — ورنہ شبنم شراب ہو جاتی

میرے قطعات کے گلستاں میں
حُسن کا دردناک عالم ہے
پھول ہیں بے شمار زخموں کے
اَن گنت آنسوؤں کی شبنم ہے

غم کی راتوں کے خواب لایا ہوں
ہدیۂ اضطراب لایا ہوں
شوخ لفظوں کے آبگینوں میں
آنسوؤں کی شراب لایا ہوں

روح کی آنچ میں اُبالا ہے
مدّتوں خونِ دل سے پالا ہے
اپنے شعروں میں جب کہیں میں نے
زندگی کی تڑپ کو ڈھالا ہے

درد کو ڈھالتے ہیں نغموں میں
سوز کو ساز میں بدلتے ہیں
داد دے ہم کو اے غمِ دُنیا
زخم کھا کر بھی پھول اُگلتے ہیں

کیسے بے سوز لوگ ہو یارو!
کیا خبر کس جہاں میں رہتے ہو
میرے احساس کے شرارے ہیں
تم جنہیں میرے شعر کہتے ہو

سالہا سال کی تلاش کے بعد
زندگی کے چمن سے چھانٹے ہیں
آپ کو چاہئیں تو پیش کروں
میرے دامن میں چند کانٹے ہیں

یوں تو آبِ حیات کا چشمہ
اس کی رگ رگ میں رقص کرتا ہے
شاعری کا خود اپنا حسن مگر
زہر پینے ہی سے نکھرتا ہے

ایک شاعر کی آنکھ جب چاہے
حسن فطرت کو تول سکتی ہے
دیکھ سکتی ہے نکہتِ گُل کو
چاند تاروں سے بول سکتی ہے

وہی انداز اور وہی تیور
وہی نرمی وہی رسیلا پن
دیکھ کر تجھ کو سوچتا ہوں میں
یہ میرا شعر ہے کہ تیرا بدن

زہرِ آلام کی ضرورت کیا
سرخوشی کی نبات کافی ہے
ایک شاعر کی جان لینے کو
ایک عورت کی ذات کافی ہے

درد احساس کے کنائے ہیں
اَن گنت حسرتوں کے سائے ہیں
دیکھ کر آپ کی اُداس آنکھیں
شعر فانیؔ کے یاد آئے ہیں

مہ وشوں کے حضور میں دیکھا
حلقۂ رنگ و نور میں دیکھا
خانہ برباد شادؔ کو ہم نے
جب بھی دیکھا سرور میں دیکھا

اپنے غم پر تو خندہ زن ہے مگر
دوسروں کے غموں پہ روتا ہے
شادؔ کو دیکھ کر ہوا ثابت
سخت جاں نرم دل بھی ہوتا ہے

زلف وہ پُر فسوں حقیقت ہے
جب بھی اُلجھی غمِ حیات بنی
جب بھی نکھری سیاہ رات ہوئی
جب بھی لہرائی کائنات بنی

چاہتا ہوں کہ چوم لوں ان کو
کیسے دلکش ہیں شام کے سائے
جیسے اِک سانولی سی بنگالن
مسکراتی ہو بال بکھرائے

استنے نادان پھر کہاں ہوں گے
ایسے ارمان پھر کہاں ہوں گے
تم تو مل جاؤ گے کہیں نہ کہیں
ہم مری جان! پھر کہاں ہوں گے

چاندنی رات میں تری زلفیں
جیسے کچھ الجھنیں نگاہوں کی
یا کسی پاکباز کے دل میں
حسرتیں ان کیے گناہوں کی

ہر نفس گلستاں بکف ہوتا
ہر نظر منظر آفریں ہوتی
آپ ہوتے کہیں جو ایسے میں
رات کچھ اور بھی حسیں ہوتی

فرش مرمر پہ رقص کرتی ہے
اس طرح اِک حسینۂ گل فام
جس طرح حوض میں گلاب کا پھول
یا شبِ ماہ میں شراب کا جام

اب تو کاجل کی کوئی گنجائش نہ
واقعہ ہے نہیں ہے آنکھوں میں
دوسری شئے سماتے بھی کیوں کر
جب کہ ساجن مکیں ہے آنکھوں میں

شوق کی بے بسی نہیں جاتی
دِل کی بے چارگی نہیں جاتی
آپ کو دیکھنا بھی مشکل ہے
آنکھ بھی بند کی نہیں جاتی

روحِ تخلیق ناچ اُٹھی ہوگی
ذہن پر کیف چھا گیا ہوگا
تو بھی دے کر وجود عورت کو
اے خدا جھوم جھوم اُٹھا ہوگا

ہر حسیں کافرہ کے ماتھے پر
اپنی رحمت کا تاج رکھتا ہے
تو بھی پروردگار! میری طرح
عاشقانہ مزاج رکھتا ہے

جب بھی مَیں نے تجھے بُھلایا ہے
واقعہ ہے فریب کھایا ہے
کیونکہ ہر اِک خیال سے مجھ کو
صرف تیرا خیال آیا ہے

اُس کے جسمِ لطیف و نازک سے
بوجھ زیور کا کب سنبھلتا ہے
اپنے بارِ جمال کے باعث
جو حسیں ڈگمگا کے چلتا ہے

جھوم جاتی ہے دخترِ رز بھی
آبگینے نثار ہوتے ہیں
دیکھ کر تیری مدھ بھری آنکھیں
میکدے شرمسار ہوتے ہیں

زندگی میں گناہ کی فرصت
جب ملی بھی تو کیا قلیل ملی
صاف گوئی معاف ہو یارب!
تیری رحمت بہت بخیل ملی

یوں تصور میں گونج اٹھتی ہے
تیرے لہجے کی نقرئی جھنکار
جیسے دھیمے سُروں سے جنگل میں
اِک حسینہ بجا رہی ہو ستار

تیرے چہرے کے سانولے پن میں
بھیگی بھیگی مٹھاس ہوتی ہے
جیسے پچھلے پہر دھندلکے کو
صبحِ صادق کی آس ہوتی ہے

پتّی پتّی گلاب ہو جاتی
ہر کلی محوِ خواب ہو جاتی
تو نے ڈالیں نہ مئے فشاں نظریں
ورنہ شبنم شراب ہو جاتی

صبح کے وقت غسل فرما کر
جب بھی تو راہ سے گزرتی ہے
تیرے ہر نقشِ پا کی شوخی پر
روحِ تقدیس وجد کرتی ہے

کچھ یقیں عقل پر نہیں ہے مجھے
اعتمادِ نظر نہیں ہے مجھے
یہ خبر ہے کہ تم ہو میرے قریب
میں کہاں ہوں خبر نہیں ہے مجھے

نشہ گذرے گا اپنی حد سے اگر
کیف کا ساز ٹوٹ جائے گا
پھیر لو اپنی مدھ بھری آنکھیں
ہاتھ سے جام چھوٹ جائے گا

زیست کیا موت کے بھی سینے میں
دلِ پُر نور بن کے دھڑکے گا
عشق وہ لازوال شعلہ ہے
جب بجھاؤ گے اور بھڑکے گا

کچھ مرقعے ہیں شادمانی کے
چند عنواں ہیں اِک کہانی کے
چاندنی، زلف، رقص، شعر، شراب
مختلف نام ہیں جوانی کے

اپنا آنچل فضا میں لہرا کر
کس حسینہ نے کیف باری کی
گنگنانے لگے ہیں سناٹے
جگمگانے لگی ہے تاریکی

ذرّہ اور رشک ماہ و انجم ہو
موج اور اُس میں یہ طلاطم ہو
بارہا سوچتا ہوں میں، شاید
میرے سینے میں دل نہیں تم ہو

زخمِ دل پھول بن ہی جاتے ہیں
روح پُرنور ہو ہی جاتی ہے
لاکھ برہم ہو، میکدے میں مگر
زلیست، مسرور ہو ہی جاتی ہے

ذہن پر گرد سی جمی دیکھی
نبض ہستی تھمی تھمی دیکھی
ہوش میں جس نے بھی مجھے دیکھا
اُس نے مجھ میں مری کمی دیکھی

کون کہتا ہے شاعری میری
زندگی سے نہیں ہے ہم آہنگ
میرے ہر شعر سے ٹپکتا ہے
کیف اور شراب ناب کا رنگ

ہم زبانِ سکوت میں ساقی
کس قرینے سے بات کرتے ہیں
دردِ دل کہہ رہے ہیں صہبا سے
آبگینے سے بات کرتے ہیں

ایک ساغر فضا میں لہرا کر
رُخ حوادث کا پھیر دے ساقی
زندگی کے علیل چہرے پر
مسکراہٹ بکھیر دے ساقی

اپنی قسمت بدل گئی آخر
بے خودی چال چل گئی آخر
گردشِ جام! شکریہ تیرا
گردشِ وقت ٹل گئی آخر

مضمحل ذہن کے شبستاں میں
جگمگانے لگے ہیں لہرا کر
جب ذرا سی شراب چھڑکی ہے
میں نے اپنے حزیں خیالوں پر

وقت کی تشنگی مٹانے کو
تجھ سے سیّال آگ لیں ساقی
عمر باقی پڑی ہے سونے کو
آج کی رات جاگ لیں ساقی

داورِ حشر! دیکھنا کیا ہے
میں وہی رندِ لا اُبالی ہوں
اس سے پہلے کہ تو سوال کرے
میں خود اِک جام کا سوالی ہوں

ساقیا! ساقیا! سنبھال اِسے
چھلکنے دے نہ کوئی جام اِسے
گردشِ روزگار آئی ہے
ایک دو ساغروں سے ٹال اِسے

رات ہم بھی پئے ہوئے تھے مگر
آپ کی آنکھ بھی شرابی تھی
پھر ہمارے خراب ہونے میں
آپ ہی کہئے کیا خرابی تھی

ڈوبتی سانس کو اُبھارا ہے
نبض گرتی ہوئی سنبھالی ہے
مئے کو ساغر میں ڈال کر ساقی!
جان میں تو نے جان ڈالی ہے

جو بہت ہوش مند بنتا ہے
در حقیقت اُسے بھی ہوش نہیں
زندگی کے شراب خانے میں
کون ہے جو شراب نوش نہیں

اے غمِ دل! بہار بن کے مجھے
میکدے کی فضا پہ چھانے دے
مدتوں بعد مسکرایا ہوں
آج جی بھر کے مسکرانے دے

ہر تمنا گناہ بن جائے
ہر نفس سرد آہ بن جائے
مئے کدے کا وجود ہو نہ اگر
زندگی خانقاہ بن جائے

شیخ صاحب! کبھی خدا کے لئے
آپ اتنا تو غور فرمائیں
وہ کہاں جائیں میکدے کے سوا
جن کو دیر و حرم نہ اپنائیں

شیخ صاحب! مقابلہ کیسا
آپ کا ہم شراب نوشوں سے
ایک عصمت فروش بہتر ہے
آپ جیسے خدا فروشوں سے

آگہی کا شعور کم کم ہے
بادہ خانے میں نور کم کم ہے
کھول دے اپنی مدھ بھری آنکھیں
آج مئے میں سرور کم کم ہے

عشرتِ لاجواب بنتی ہے
مستی بے حساب بنتی ہے
لبِ لعلینِ یار کو چھُو کر
مسکراہٹ شراب بنتی ہے

کیسے یک دم فضا بدلتی ہے
یہ کرشمہ ابھی دکھاتا ہوں
تم ذرا گیسوؤں کو بکھراؤ
میں بھی لہرا کے جام اُٹھاتا ہوں

زلیست کی پیچ دار راہوں کو
"زلفِ خوباں کے خم سمجھتے ہیں
گردشِ وقت کو بھی ہم ساقی!
گردشِ جام جم سمجھتے ہیں

آخری بار اپنے ہونٹ ذرا
آبِ خوشرنگ میں بھگو آؤں
ابھی چلتا ہوں اے اجل! لیکن
مَیں ذرا میکدے سے ہو آؤں

عالمِ بے خودی کے بعد اکثر
ہوش میں آئے ہم تو یہ جانا
زہر قاتل ہے ہوش کی تلخی
اِک حماقت ہے ہوش میں آنا



گنیش بہاری طرزؔ

گنیش بہاری طرز

آمد : لکھنؤ ۱۸/ مئی ۱۹۲۸ء

گنیش بہاری سریواستوا نام، طرز تخلص۔ لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۴۹ء میں لکھنؤ یونیورسٹی سے بی اے اور ۱۹۵۶ء میں ایل ایل بی کیا۔ ملازمت کی شروعات ۱۹۴۹ء میں ہی بحیثیت انسپکٹر ادیکری پراپرٹی، لکھنؤ سے کی اور ۱۹۸۶ء میں ڈپٹی چیف کنٹرولر آف امپورٹس اینڈ ایکسپورٹ، بمبئی کے عہدے سے وظیفہ یاب ہوئے۔

طرز کھرے لکھنوی ہیں اس لئے شعر و سخن سے شغف بچپن ہی سے اُن کی ذات کا حصّہ ہے۔ اِس کے علاوہ موسیقی سے بھی اُنہیں خاص لگاؤ ہے۔ شروع میں وہ اپنی پسند کی غزلوں کی دُھنیں بناتے اور مختلف محفلوں میں سُنایا کرتے۔ ۱۹۴۹ء میں خود شاعری شروع کی اور فضل نقوی سے اصلاح لینے لگے۔ بعد ازاں سراج لکھنوی کے شاگرد ہوئے اور یہ سلسلہ سراج صاحب کی وفات تک چلتا رہا۔

طرز بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔ اُن کے لہجے کی غنائیت اور لفظیات کے انتخاب کا محتاط رویہ اُنہیں دبستانِ لکھنؤ سے ورثہ میں ملا ہے اور وہ اس ورثہ کا احترام آج تک کرتے ہیں۔ طرز اُردو غزل کی روایات سے کما حقہٗ واقف ہیں اور انہوں نے غزل گوئی کے فن کو اُنہیں روایات کا پورا احترام کرتے ہوئے برتا ہے۔ ساتھ ہی اُنہوں نے اپنی غزلوں کو جدید حسّیت کی آنچ بھی دی ہے۔

رسالہ 'فن اور شخصیت' طرز پر ایک خاص نمبر شائع کر چکا ہے۔

طرز موجودہ دور کے ایک اچھے غزل گو شاعر ہیں۔ اُن کی غزلیں اُردو شاعری کی مثبت اور قوی روایات کا نمونہ ہونے کے باوجود روایتی نہیں ہیں۔ اُن کے قطعات میں بھی اُن کا منفرد رنگ جھلکتا ہے ؎

طرز پڑھتا ہے کوئی جب جھوم کر نظم و غزل
ایسا لگتا ہے فراق و جوش ہیں یاروں کے بیچ

آسرا جب بھی کوئی لوٹتا ہے
ایک چھالا سا دل میں پھوٹے ہے
کیا کہوں اُس کے پیار کا عالم
پھلجھڑی سی بدن سے چھوٹے ہے

اجنبی بن کے ہنسا کرتی ہے
زندگی کس سے وفا کرتی ہے
کیا جلاؤں میں محبت کے چراغ
ایک آندھی سی چلا کرتی ہے

کھو کے خود اُن کو پا کے پیتا ہوں
اِک فضا سی بنا کے پیتا ہوں
لوگ پانی ملا کے پیتے ہیں
میں نگاہیں ملا کے پیتا ہوں

تلخیوں میں سما کے پیتا ہوں
جاں کی بازی لگا کے پیتا ہوں
غم سے گھبرا کے لوگ پیتے ہیں
غم کو مَے میں بنا کے پیتا ہوں

کس لئے اب حیات باقی ہے
کیا کوئی واردات باقی ہے
طرزؔ کیسے کٹیں گے یہ لمحات؟
جام خالی ہے رات باقی ہے

مے کشی کا شباب باقی ہے
ہوش بے اضطراب باقی ہے
زندگی تھوڑی دیر ساتھ نہ چھوڑ
جام میں کچھ شراب باقی ہے

حلقۂ مے سے کسی کو بھی نکلنے نہ دیا
اُٹھ کے کچھ دور کبھی میخانے سے چلنے نہ دیا
دَور پر دَور چلاتی رہی اک مست نظر
آج تو جام بھی ساقی سے بدلنے نہ دیا

غم کی تاریک فضاؤں سے نکلنے نہ دیا
شمع روشن جو کوئی کی بھی تو جلنے نہ دیا
تم نے یہ کیا کیا اے جھوٹی امید کہ مجھے
صبح کی آس تو دی رات کو ڈھلنے نہ دیا

جسمِ شفّاف میں شعلہ سا رواں ہو جیسے
کھلکھلاہٹ میں بھی آوازِ سناں ہو جیسے
تیر چلتے ہوئے دیکھوں تو بچاؤں دل کو
اُف وہ انگڑائی کہ ارجن کی کماں ہو جیسے

نقش تیکھے بانکی چتون دانت موتی کی قطار
صبح کی لالی کا منظر اس کی رنگت کا نکھار
جھوم کر رہ رہ کے اس کے کھلکھلانے کا سماں
پھول برسائے ہوا سے جیسے شاخِ ہرسنگھار

سمیٹ لو ذرا آنچل، کہ روشنی پھیلے
بجا دو پاؤں کی چھاگل کہ نغمگی پھیلے
نقاب زلفوں کی چہرے پہ خوب ہے لیکن
ہٹا دو چاند سے بادل کہ چاندنی پھیلے

اب کیا بتائیں کیا تھا سماں پیرہن کے بیچ
جذبات ہو رہے تھے جواں پیرہن کے بیچ
کیا جھلملی بھی روکتی گورے بدن کی آنچ
پگھلا ہوا تھا شعلہ رواں پیرہن کے بیچ

اُن کو سجدہ کر لیا محبوب کی تصویرِ جان
خاک پا آنکھوں میں لی اے چارہ گر اکسیرِ جان
چشم ابرو، زلف خوشبو، رنج و راحت مرگ و زیست
یہ سبھی ہیں نعمتیں لیکن انھیں زنجیرِ جان

عاشقی میں تصوّف نورِ تنویرِ غزل
میکشی میں جام کوثر سے ہو تعبیرِ غزل
رنگ خونِ دل کا ہو چھڑکاؤ ہر ایک شعر پر
تب کہیں بنتی ہے جا کر ایک تصویرِ غزل

خادمِ اردو زباں ہوں شاعری مکتب مرا
اور بھی رشتے ہیں لیکن دوستی مذہب مرا
لکھنؤ میرا وطن ہے بمبئی میرا نصیب
طرزؔ کہتے ہیں مجھے سب، میکشی مشرب مرا

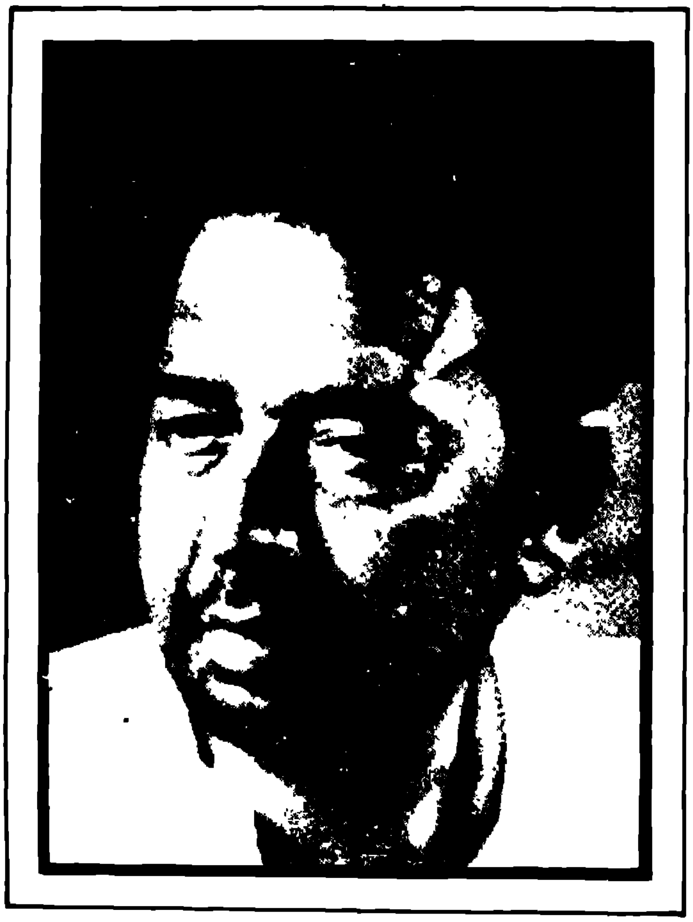
کیا ضد ہے کہ برسات بھی ہو اور نہیں بھی ہو
تم کون ہو جو ساتھ بھی ہو اور نہیں بھی ہو
پھر بھی اُنھیں لمحات میں جانے سے فائدہ؟
پل بھر کو مُلاقات بھی ہو اور نہیں بھی ہو

سانپ ڈستا ہے تو ہم پھر بھی دُعا دیتے ہیں
حد میں رہتا ہے تو اک حد بھی بنا دیتے ہیں
اور جو کم ظرف کوئی حد سے گذر جاتا ہے
ہم فقط اس کو نگاہوں سے گرا دیتے ہیں

لمحہ لمحہ موت کو بھی زندگی سمجھا ہُوں مَیں
دوسروں کی ہی مسرّت کو خوشی سمجھا ہُوں مَیں
کیا بتاؤں کون ہوں میں نے تو دیکھا ہی نہیں
آپ نے جو کہہ دیا خود کو وہی سمجھا ہُوں مَیں

تیروں کی مشق کرنے کا چکّر نہیں ہُوں مَیں
چُن چُن کے توڑ دینے کا ساغر نہیں ہُوں میں
مجھ کو بھی پیار چاہیئے۔ انسان ہُوں مَیں بھی
مجھ میں بھی جان ہے کوئی پتّھر نہیں ہُوں مَیں

پُوچھا کیسے؟ تو ہنس کے فرمایا
بس یُونہی ایک نگاہ کرنا تھی
اور یہ بن ٹھن کے کِس لئے آئے
بولے دُنیا تباہ کرنا تھی



پریم وار برٹنی

پریم وار برٹنی

آمد: ڈنگا (ضلع گجرات پاکستان) ۹ نومبر ۱۹۳۰ء
رخصت: چنڈی گڑھ ۱۹۷۹ء

پریم وار برٹنی، سوہنی مہیوال کی بستی ڈنگا، ضلع گجرات (پاکستان) میں پیدا ہوئے تھے بعد کو اُن کے والد وار برٹن، ضلع شیخوپورہ (پاکستان) منتقل ہو گئے تھے۔ اسی مناسبت سے پریم نے اپنے نام کے ساتھ وار برٹنی جوڑ لیا تھا۔ پریم نے وار برٹن ہائی اسکول سے میٹرک پاس کی اور فلم میں ہیرو بننے کے چکر میں پندرہ برس کی عمر میں گھر سے بھاگ کر لاہور پہنچے۔ فلموں میں کام نہیں ملا۔ مایوس ہو کر گھر لوٹ آئے۔ لیکن پھر بھی زندگی میں باقاعدگی میسر نہ آئی۔ تقسیم وطن کے بعد سات برس تک مالیر کوٹلہ میں رہے جہاں کے ادبی ماحول نے پریم کے اندر چھپے ہوئے شاعر کو جگا دیا۔

پریم کی پہلی نظم "آئینہ جذبات" دہلی کے روزنامہ "پرتاپ" میں ۱۹۵۰ء میں چھپی۔ اس کے بعد وہ مسلسل رسالوں اور جریدوں میں لکھتے رہے۔ پھر بمبئی آ گئے اور لگ بھگ دس سال بمبئی میں فلموں کے گیت لکھتے رہے لیکن وہ ایسے پارہ صفت تھے کہ دل لگا کر کبھی کام نہ کر سکے۔ اُن کی مے نوشی سے اُن کے اکثر دوست احباب نالاں رہا کرتے تھے۔ بمبئی میں چند سال بہت ہی کسمپرسی کی حالت میں گزارے۔ شراب زدہ ہو کر رہ گئے اور پھر اچانک چنڈی گڑھ چلے گئے اور وہیں وفات پائی۔

پریم کی ابتدائی شاعری اُردو کی روایتی شعر گوئی کا چربہ تھی۔ تاہم وقت کے ساتھ ساتھ اُن کے شعری اسلوب میں ندرت اور انفرادیت آ گئی۔ پریم کی شاعری جمالیاتی قدروں سے مزیّن ہے اس لئے بعض ناقدین انھیں شاعرِ جمال بھی کہتے ہیں۔ پریم نے اپنے اچھوتے شاعرانہ تخیّل کو ذہنی حقائق سے ٹکرا کر ایک منفرد آہنگ پیدا کرنے کی کوشش کی اور اس میں بڑی حد تک کامیاب بھی رہے۔ اُن کی زبان رواں اور سادہ ہے۔ ساتھ ہی انھوں نے اُردو شاعری کو نایاب تشبیہات اور استعارات سے سنوارا ہے ؎

آخر اُس کی سوکھی لکڑی ایک چِتا کے کام آئی
ہرے بھرے قِصّے سنتے تھے جس پیپل کے بارے میں

تو وہ تخلیق کی افسردہ فضا ہے جس سے
ماند ہے میرے تخیئل کا ہم رنگ، ریاض
تیر زندہ نہ ہوئے ورنہ دکھاتا اُن کو
تیری آنکھوں کا تخیئل، تیرے چہرے کی بیاض

کتنے پاکیزہ ہیں نوخیز جوانی کے کلس
نظر آتا ہے ترا جسم شوالے کی طرح
اپنے گیتوں کے مدھوبن میں بلاتا ہے تجھے
میرا بچپن کسی گوکل کے گوالے کی طرح

جھلملاتے ہوئے سپنوں کا سوئمبر بن کر
بجلیاں سی میرے احساس میں لہرائی ہیں
نظر آتا نہیں کچھ بھی ترے جلووں کے سوا
تیری آنکھیں میری آنکھوں میں اُتر آئی ہیں

کتنے سپنوں کے مکٹ ٹوٹ گئے اک پل میں
کتنی یادوں کے تلک وقت کے ماتھے سے ڈھلے
میں نے دھوئے ہیں ترے دھول بھرے پاؤں مگر
اپنی آنکھوں کے محبت بھرے گنگا جل سے

سنہرے پھولوں کے دل آویز ستاروں کی برات
چند یادیں تھیں محبت بھرے افسانوں کی
پیار کے دیس میں پہلا ہی قدم رکھا تھا
ڈولیاں لُٹ گئیں چلتے ہوئے ارمانوں کی

اپنے ماتھے پر سجائے ہوئے صندل کا تلک
آج آئی ہے تری یاد کی جوگن ایسے
آرتی میری اُتارے گی مرے ہی گھر میں
اور پھر لوٹ کے جائے گی نہ شاید جیسے

ہاتھ جو بہرِ دُعا اُٹھے ہیں جھک جائیں گے
ہر نظر تشنہ بلب ہو کے دُہائی دے گی
آپ پردے میں چھپالیں گی نہ چہرہ جب تک
عید کے چاند کی صورت نہ دکھائی دے گی

آج ہے اہلِ محبّت کا مقدس تیوہار
رنگ کیوں لائے نہ معصوم دعاؤں کا اثر
عید کا دن ہے چلو آج گلے مل جائیں
تم ہو مسجد کی اذاں، مَیں ہوں شوالے کا گجر

پھر بجے میرے خیالوں میں سنہرے کنگن
بھُولے بسرے ہوئے لمحات مجھے یاد آئے
عید کے روز کسی نے بھی دعا جب مانگی
دو حسیں مہندی لگے ہاتھ مجھے یاد آئے

بہت مختصر سا تعارف ہے میرا
نہ جوشِ جنوں ہوں نہ رازِ نہاں ہوں
کتابوں میں مجھ کو کہاں ڈھونڈتے ہو
میں چہرے پر لکھی ہوئی داستاں ہوں

دُور پیپل کی بوڑھی شاخوں میں
اِک پرندہ سا پھڑپھڑایا ہے
دلِ بیتاب ! دیکھنا تو ذرا ۔
کیا کسی نے مجھے بلایا ہے

مَیں نے دیکھا جب آدمی کا لہو
زر پرستی کے آبگینے میں
میرا احساس دل دھڑکنے لگا
شاعری کے گداز سینے میں

سنسناتی ہوئی ہوا کی طرح
یوں تیری یاد ذہن میں آئی
دن ڈھلے دور جنگلوں میں کہیں
جیسے روتی ہو شام تنہائی

جُھک گئیں مل کے اجنبی آنکھیں
دل سے دل ہم کلام ہو نہ سکا
ہائے مجبوریاں محبت کی
ہاتھ اُٹھے، سلام ہو نہ سکا

رات بوجھل بھی ہے بھیانک بھی
دل کے مدھم دیئے میں تیل نہیں
جان دینا بہت کٹھن ہی سہی
زندہ رہنا بھی کوئی کھیل نہیں

تیری خوش رنگ چوڑیاں اب تک
ذہن میں بج رہی ہیں کچھ، ایسے
جیسے پاگل کے پاؤں میں زنجیر
یا بھکاری کی جیب میں پیسے

دیدۂ دل کو یوں نظر آیا
ایک دھندلی سی یاد کا چہرہ
جیسے، دلہن کی مانگ میں مٹی
جیسے، بیوہ کے ہاتھ میں سہرہ

سُرخ ہونٹوں کی تازگی کے لئے
خون کس نے دیا جوانی کا
مجھ کو پہچان اے نگارِ حیات
مَیں ہوں عنوان تری کہانی کا

اوس میں بھیگی ہوئی تنہائیوں کے جسم سے!
آرہی ہے تیرے پیرہن کی خوشبو اس طرح
نرم خوابوں کے شبستانوں میں لہراتی ہوئی
گنگنائے رات کی الہڑ جوانی جس طرح

نہ اہلِ میکدہ نے مسکرا کر بات کی ہم سے
نہ تیری ہی جبیں سے بے رخی کے بل گئے ساقی
اگرچہ بزم میں صہبا بھی تھی مینا بھی تھی لیکن
خود اپنی تشنگی کی آگ میں ہم جل گئے ساقی



نوا لکھنوی

نوا لکھنوی

آمد : لکھنؤ۔ یکم جون ۱۹۳۷ء

سید قائم رضا نام، نوا تخلص، لکھنؤ کے سادات نقوی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ والد سید محمد اطہر حسین پرتو لکھنوی بھی خادم شعر و ادب تھے۔ نوا لکھنوی کے ادبی ورثہ میں مسندِ ناسخ، مقصدِ رشک و جلال، فنِ آرزو اور جانشینیِ پرتو آتی ہے۔ نوا کی ادبی کارگذاری میں پانچ ہزار رباعیات، ایک ہزار غزلیات، ایک ہزار سلام، پانچ سو تاریخی قطعات، سو قصائد، سو قطعات، پچاس سہرے، چند نظمیں، چند نغمے، ایک مرثیہ، ایک ترکیب بند اور ایک ترجیع بند شامل ہے۔ ان دنوں اُردو عروض، خاتم الالسنہ کا رسم الخط، خانوادۂ ناسخ، سوانح حیات اُردو اور تاریخ ایسٹ انڈیا کمپنی زیرِ قلم ہے۔

بحیثیت صحافی ہفت روزہ ستارہ بمبئی ۱۹۵۹ء اور پندرہ روزہ تفنگ بمبئی ۱۹۷۱ء تا ۱۹۷۳ء خدمات انجام دے چکے ہیں اور ان دنوں فلم نگاری کو پیشہ بنائے ہوئے ہیں۔ ۱۹۴۶ء میں پہلی بار بمبئی تشریف لائے اور اس کے بعد ۱۹۵۶ء سے یہیں مستقل قیام ہے۔ نوا لکھنوی کا خاندان شاہی دور میں جاگیر دار تھا۔ لیکن وہ جاگیر شاہانِ اودھ اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے معاہدوں کے تحت انگریزی تصرف میں آجانے کی وجہ سے انگریزی سیاست کی نذر ہوگئی مگر ذاتی لیاقت اور صلاحیت کی وجہ سے ان کے بزرگ ہمیشہ نمایاں حیثیت کے حامل رہے۔

نوا لکھنوی کے دادا سید ذاکر حسین مرزا دبیر کے شاگرد و مرزا مغل سعید کے شاگرد تھے اور سر سید کے قائم کردہ کالج کے اوّلین طلباء میں سے ایک تھے۔ والد سید محمد اطہر حسین پرتو لکھنوی، علامہ آرزو لکھنوی کے مخصوص شاگردوں میں تھے اور علامہ کے بعد وہی ان کے جانشین قرار پائے اور ان کے بعد نوا لکھنوی۔ اُن کے خاندانی ادبی ذخیرے کا ذکر اکثر کتبِ ادب میں آیا ہے۔ افضل حسین ثابت لکھنوی ثم کوٹوی کی دربارِ حسین اور حیاتِ دبیر نامی تصانیف اس کتب خانے کی مواد سے تحریر کی گئیں۔ پروفیسر مسعود حسن ادیب کی تاریخِ مرثیہ میں میر ضمیر سے پہلے کے مرثیہ گویوں کا کلام اور حالاتِ زندگی اِسی ذخیرے سے حاصل ہوسکے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی کے پی ایچ ڈی کے مقالے کے لئے مواد اِسی کتب خانے سے حاصل کیا گیا۔ خود پرتو لکھنوی کی یادگار کتاب "لکھنؤ مرکزِ زبان و ادب" اِسی کتب خانے کی مواد سے لباسِ وجود سے آراستہ ہوئی۔

ہند و پاک میں عروض پر نگاہ رکھنے والے جو گنتی کے چند افراد ہیں ان میں نوا لکھنوی بھی شامل ہیں۔

کون جانے کہ خیالات ہیں دل میں کیسے
چشم و ابرو کی مگر دیکھی اشارت اچھی
دستِ نازک کی عنایت نظرِ خاص کی مہر
مجھ سے تو ہے مری تصویر کی قسمت اچھی

ایک گردش سے شب آغوشِ سحر میں یہ بٹھادیں
بس کہ نیرنگیِ آفاق کا نظارہ دکھادیں
ارے توبہ ہے ارے توبہ شکن مست یہ آنکھیں
مری تصویر کو دیکھیں مجھے متوالا بنا دیں

ہاں آئینے میں نازکی تصویر دیکھ لو
گیسو کے خم میں حُسن کی زنجیر دیکھ لو
غصّہ اگر ہے مجھ پہ تو وہ بھی ہے اک ادا
چینِ جبیں میں عشق کی تصویر دیکھ لو

آنکھوں سے راز فاش ہے سب دل کے حال کا
اس وقت تو خیال ہے مجھ خوش مآل کا
جادو بھری نگاہ تصوّر میں جم گئی
کاغذ پہ کھنچ گیا وہی نقشہ خیال کا

میخوار ہوں میں وسعتِ میخانہ دل میں ہے
ساغر ہے کس شمار میں خم کس حساب میں
بات آپڑی ہے ظرف کی ساقی تو یوں سہی
کوثر انڈیل دے میرے جامِ شراب میں



صابر دت

صابر دت

آمد : میر پور (پاکستان) ۹/ستمبر ۱۹۳۸ء

گل بھوشن دت نام، تخلص صابرؔ، پاکستان کے شہر میر پور میں پیدا ہوئے۔ والد تھانیدار تھے اس لئے صابر دت کا بچپن بڑا ہی خوشگوار گزرا لیکن ابھی اُن کی عمر آٹھ نو برس کی ہی تھی کہ کشمیر کی سرسبز وادیاں انسانی خون سے لالہ زار ہو گئیں اور انہوں نے اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے باپ کو قتل ہوتے دیکھا۔ آگ اور خون کا دریا پار کر کے انہوں نے کم عمری میں آزاد ہندوستان کی سرحدوں میں قدم رکھا۔ اس کے بعد زندگی ایسی ہی گزری جیسے ایک یتیم مہاجر لڑکے کی گزرتی ہے کبھی رفیوجی کیمپ میں، کبھی عزیز و اقارب کے رحم و کرم پر۔ گوڑگاؤں (ہریانہ) کے درونا چاریہ کالج سے بی اے کیا پھر گھر چھوڑا اور دہلی بسالی۔ ہندی میں 'روپ' نام سے رسالہ نکالا۔ اس کے بعد اُردو میں پندرہ روزہ 'دلّی والا' شروع کیا۔ ایک مشاعرے کے سلسلے میں بمبئی آنا ہوا۔ شہر پسند آیا اور یہیں مستقل سکونت اختیار کر لی۔

۱۹۷۵ء سے رسالہ 'فن اور شخصیت' نکال رہے ہیں جسے اُردو ادب کے ناقدین نے ایک تاریخ ساز رسالہ تسلیم کر لیا ہے۔ صابر دت کو اُن کی ادبی خدمات کے اعتراف کے طور پر صوبائی اکادمیوں سے کئی اعزازات مل چکے ہیں ـــــ صابر دت کا پہلا شعری مجموعہ 'پل دو پل' ۱۹۶۶ء میں شائع ہوا اور دوسرا مجموعہ کلام 'موجِ عارض' ۱۹۹۳ء میں شائع ہوا جس میں شامل نظم 'سچی کتھا' کو مشہور غزل سنگر جگجیت سنگھ نے بڑے ہی پُر اثر انداز میں 'سچی بات' کے طور پر گایا ہے اور اسے اپنے تازہ کیسٹ 'فیس ٹو فیس' میں شامل کیا ہے۔ غزل کیسٹ کی تاریخ میں پہلی بار نظم 'سچی بات' کثیر سرمایہ سے باقاعدہ فلم بند کر کے ملکی اور غیر ملکی ٹی وی نیٹ ورک پر نمائش کے لئے پیش کی گئی ہے ـــــ صابر دت کی شاعری رومانیت، لہجہ کی غنائیت اور شدّتِ جذبات کی آمیزش سے مرصّع ہے۔ وہ سیاسی اور سماجی مسائل کو بھی اپنے طرزِ اظہار میں ڈھال کر شعری مرتبہ عطا کرنے کے فن سے واقف ہیں۔ اُن کی غزلیں خوبصورت تشبیہوں اور استعاروں سے مزیّن ہوتی ہیں اُن کی نظمیں اپنی رومانیت کے باوجود قاری کے ذہن کو تحریک دیتی ہیں۔ صابر دت کی شاعری کا ایک اہم حصّہ اُن کے قطعات ہیں جن کا جادو قاری کو لطیف سحر انگیزی سے روشناس کراتا ہے ؎

ہم نے دیکھی تو نہیں رسمِ وفا
آپ کہتے ہیں تو اچھی ہو گی

آنکھوں کے گلابوں کو نظموں میں چھپا لوں گا
زلفوں کے اُجالوں سے غزلوں کو سجا لوں گا
ہونٹوں سے تراشوں گا اشعار کی کلیوں کو
سوئی ہوئی نیندوں سے قطعات چُرا لوں گا

وقت بڑھتا رہا موسم موسم
نئی رُت آئی نئے پھول کِھلے
اِنہیں راہوں میں گذرگاہوں میں
تم سے پہلے بھی کئی لوگ ملے

زندگی تونے کہانی دے دی
باتوں باتوں میں نشانی دے دی
رُخِ رنگیں سے اُٹھا کر آنچل
سارے موسم کو جوانی دے دی

حال کا لمحہ لمحہ چھلنی ہے
وقت کو راہ سے ہٹاتا ہوں
دیکھو شائد پلٹ کے تم مجھ کو
لو میں ماضی میں لوٹ جاتا ہوں

مجھ کو تو آپ مرے خواب میں مل جائینگے
نیند اکثر مری پلکوں سے گلہ کرتی ہے
آپ بھی دیکھا کریں اپنے تصوّر میں مجھے
خواب سے خواب کی تعبیر ملا کرتی ہے

کہہ رہی ہے رَوِش کی تابانی
دیکھے بھالے اِدھر سے گزرے ہیں
آصبا ہم بھی اِس طرف سے چلیں
حُسن والے اِدھر سے گزرے ہیں

دل کی دھڑکن کے پیامات سے ڈر جاتے ہیں
عمر ایسی ہے کہ ہر بات سے ڈر جاتے ہیں
خشک پتّو نہ گرو، ٹھہرے رہو شاخوں پر
وہ اندھیروں کی ملاقات سے ڈر جاتے ہیں

آج پنگھٹ پر اس طرح تھی بھیڑ
ہر طرف لڑکیوں کا ریلا تھا
ایک آتی تھی ایک جاتی تھی
جیسے ساون میں تیج میلا تھا

ہو کر دنیا سے بیگانہ
دیکھ رہا تھا شہد کے چھتّے
آگ لگانے آ پہنچے ہیں
تیری یاد کے سوکھے پتّے

میرے ماضی سے چلی آتی ہے ہر روز وہ رات
پاس آجاتے ہیں تیرے لب و زلف و رخسار
تم سے روکا نہ گیا اپنی حسیں یادوں کو
ہم گراتے ہی رہے وقت کے بام و دیوار

اِک اماوس کی رات میں صابر
وہ جو بھولے سے بام پر آئے
یہ اماوس تو پُر بنا ٹھہری
جوتشی رتھ بتا کے پچھتائے

بیٹھی سکھیوں کے گھیرے میں دُلہن
ظاہرہ تو بہت لجاتی ہے
چور آنکھوں سے دیکھ کر کنگن
اپنے ساجن کا درشن پاتی ہے

صحنِ گلشن میں ڈھونڈتی ہے کبھی
شوخ پھولوں میں بانکپن اپنا
کبھی ندی میں دیکھتی ہے صبا
لہر کھاتا ہُوا بدن اپنا

وہ سرِ شام بام پر آئے
مُنہ کو پورب میں اس طرح موڑا
ایک سُہاگن نے دیکھ کر ان کو
ست نرائن کے برت کو توڑا

جب بھی کھلتا ہے سرِ شاخ کوئی تازہ گلاب
تم اُسے توڑ کے جوڑے میں سجا لیتی ہو
جانے کیا بات ہے تم اپنے سوادِ دنیا میں
ہر حسیں چیز کو جھنجھلا کے مٹا دیتی ہو

لہلہاتا ہوا جوان بدن
سبزۂ باغ پر شراب کا پھول
تھم گئی سانس پتّی پتّی کی
توڑتا ہے کوئی گلاب کا پھول

شور کے دائرے میں چین کہاں
بے خودی کی بہت ضرورت تھی
کر دی پیدا تپش غریبی نے
چاندنی ورنہ خوب صورت تھی

میرے ماضی کدھر بھٹکتا ہے
آ کہ میں تجھ میں رنگ بھرتا ہوں
شغلِ جام و سبو کی عمر دراز
تو سنورتا ہے میں سنورتا ہوں

سجی سجی سی ہے یہ رات آج ساتھ ہو تم
صبا کا ہاتھ میں ہے ہات آج ساتھ ہو تم
چمکتی ریت ہے، ساحل ہے اور سمندر ہے
بڑی حسین ہے ہر بات آج ساتھ ہو تم

دن تیرا حسن لے کے نکلتا ہے ان دنوں
دیتا ہوں میں پناہ فضاؤں کے راگ کو
آنگن گلابی جاڑے سے ہو جاتا ہے شفق
اپنے بدن پہ ملتا ہوں سورج کی آگ کو

ہر روز چلا جاتا ہوں مَیں رات کے در پر
اکثر مجھے اُس نے ترے دامن میں سلایا
اوڑھے ہوئے رہتی ہے تری یاد کی چادر
ہے اُس کے لبوں پر تری آواز کا سایا

ترے جمال سے دونوں جہان روشن تھے
جہاں جہاں ترے جلوے تھے رات گھوم آئے
کہیں نگاہ کی مستی کہیں شباب کے پھول
جبیں ستاروں کی تیرے جنوں میں چوم آئے

جگر کا داغ، تمنّا کا داغ، دِل کا داغ
چراغ عشق و وفا کے جلا دیئے ہم نے
تمہاری راہ میں تم پر نثار ہونے کو
روِش روِش پہ ستارے سجا دیئے ہم نے

نرم زلفوں کی جواں شام لئے بیٹھے ہیں
اُن کی آنکھوں کے حسیں جام لئے بیٹھے ہیں
پاس آنا نہ ہمارے غمِ دوراں اس وقت
ہم علاجِ غمِ ایّام لئے بیٹھے ہیں

دُور کی گھاٹیوں کے پہلو میں
جام لعلیں سا اِک شباب ڈھلا
اُف سیاہی یہ تیری زُلفوں کی
کتنی مشکل سے آفتاب ڈھلا

ابھی سے لطف و مروّت کا اہتمام نہ کر
نظر کو تیز، لبوں کو ابھی سے جام نہ کر
ابھی نہ شانے سے ڈھلکا تو ریشمی آنچل
حسین شام ہے ایسے میں قتلِ عام نہ کر

چپکے چپکے جہاں بسا لیتا
اپنا محبوب بھی بنا لیتا
گر چنبیلی کی بیل تم ہوتیں
اپنے آنگن میں خود لگا لیتا

حسنِ بے پردہ کی یلغار لئے بیٹھے ہیں
ترچھی نظروں کے کڑے وار لئے بیٹھے ہیں
دیکھئے کون شہادت کی سعادت پائے
ہاتھ میں آج وہ تلوار لئے بیٹھے ہیں

ساری دنیا سجا دی ہے ہم نے
چاندنی سی بچھا دی ہے ہم نے
تم جو آجاؤ، دیپ جاگ اُٹھیں
دھرتی قلعی کرا دی ہے ہم نے

اس طرح دل میں شبِ تنہائی
اُن کی زلفوں کا خیال آتا ہے
چاندنی رات میں جیسے صابر
سانپ صندل سے لپٹ جاتا ہے

ہم جو کافر ہیں سب کی نظروں میں
سیڑھیاں مسجدوں کی چڑھتے ہیں
کون جانے وہ پل ہی جائے ہمیں
آج ہم بھی نماز پڑھتے ہیں

گر رہے ہیں بدن پہ شاخ سے پھول
چھو رہی ہے صبا لب و رخسار
سایۂ گل میں ایک دوشیزہ
دیر سے تک رہی ہے رقصِ بہار

دُور گھاٹی سے سر اُٹھا کے شفق
ذرّے ذرّے پہ مسکراتی ہے
جیسے چپ چاپ کوئی شوخ کلی
چھپ کے سبزے پہ لیٹ جاتی ہے

دل میں لے کر ہم آس پھرتے رہے
ہم خوشی میں اُداس پھرتے رہے
تو رہی دُور دُور ہم سے مگر
ہم ترے آس پاس پھرتے رہے

دن گذرتا ہے اُن کی یادوں میں
رَوشنیٔ اشکوں سے رات کرتا ہوں
میں تو کہتا نہیں ہوں شعر کبھی
دل کے زخموں سے بات کرتا ہوں

شوخ کلیوں کو مسکرانے دے
پیڑ پودوں کو لہلہانے دے
صحنِ گلشن میں لے نہ انگڑائی
آ رہی ہے بہار آنے دے

یوں اُتارو نہ ناؤ پانی میں
موجِ طوفاں ہے سر اُٹھائے ہوئے
زندگی کے حسین کوچوں میں
موت پھرتی ہے مُنہ چھپائے ہوئے

روز حالات مارتے ہیں مجھے
روز جیتا ہوں تیری آنکھوں سے
کچھ تو مستی شراب دیتی ہے
کچھ مَیں پیتا ہوں تیری آنکھوں سے

ہر ایک موج میں شامل روانیاں تیری
سُنا رہی ہے ہر اِک شے کہانیاں تیری
مَیں تجھ سے روٹھ کے اُٹھ تو گیا ہوں محفل سے
بُلا رہی ہیں مجھے مہربانیاں تیری

چاند سا چہرہ، رات سی زُلفیں
کہکشاں سی نگاہ کے مالک
مے پلاتے ہیں سارے عالم کو
وہ سفید و سیاہ کے مالک

آسماں پر گھٹائیں چھائی ہیں
ہلکی ہلکی سی پڑ رہی ہے پھوار
اِس طرح تیری یاد آئی ہے
جیسے ساون میں کوئی گائے ملہار

بد نصیبی ہے اُس کی آزادی
زلفِ جاناں کا جو اسیر نہیں
میرے دل میں ہے آپ کی چاہت
مجھ سے بڑھ کر کوئی امیر نہیں

آرزوؤں کے پھیلے جنگل میں
جانے کیا تو نے جستجو کی ہے
کیا خبر کیا مِلے مقدر سے
مَیں نے بس تیری آرزو کی ہے

غور سے سُن یہ کس کی ہے آواز
شاید اُن کے قدم کی آہٹ ہے
یہ ہوا تو نہیں ہے اے صابرؔ
اُن کے آنچل کی سرسراہٹ ہے

ساغرِ جم خرید لائے ہیں
دیدۂ نم خرید لائے ہیں
بیچ کر زندگی کی سب خوشیاں
اِک ترا غم خرید لائے ہیں

میرے ہاتھ کی ریکھا جاگی
میرے بھاگ کا جاگا تارا
میری چھلکتی ہو گی گاگر
آج کسی نے کنکر مارا

رات آنچل سمیٹتی ہے جب
نور حسب ہر طرف بکھرتا ہے
صبح کا حسن تیرے چہرے کو
دیکھ کر اور بھی نکھرتا ہے

آ گئی تیرے ساتھ ساتھ گھٹا
مل گئے جام تیری آنکھوں سے
شیشۂ و مے کہاں سے لاتے ہم
بن گیا کام تیری آنکھوں سے

بند کرنا نہ کھڑکیاں دل کی
چاروں جانب بہار ہے دیکھو
زلف کھولے ہے بام پر کوئی
کیسی رِم جھم پھوار ہے دیکھو

راہ یوں زندگی کی موڑی ہے
پریت ساون سے ہم نے توڑی ہے
تیرے آنچل کے سائے کی خاطر
ہم نے اب کے بہار چھوڑی ہے

جلوۂ شام لے کے پیتے ہیں
رخصتِ عام لے کے پیتے ہیں
لوگ پیتے ہیں جام ٹکرا کے
ہم ترا نام لے کے پیتے ہیں

روتے روتے جلا رہے ہیں دیئے
کل جو بیٹھے تھے چاند تاروں میں
دفن ہو جاؤں گا یہیں میں بھی
رات گھوما کیا مزاروں میں

ایک مستی جو نظر کی ترے دیوانے میں ہے
وہ نہ ساغر میں، نہ مینا میں نہ پیمانے میں ہے
دیکھ لغزش آگئی کیسی ترے نے نوش میں
کل ترے در پر تھا لیکن آج میخانہ میں ہے

نغمہ و رنگ کی بارات مجھے سونپ گئی
جام و صہبا کی ہر اک بات مجھے سونپ گئی
ڈھل گئی رات مرے دل کا سکوں ساتھ لئے
آپ کے چہرے کی سوغات مجھے سونپ گئی

لمس ملتا ہے تیرے ہاتھوں کا
تیری زلفوں کی چھاؤں پاتا ہوں
رات کے پاس ہیں تری یادیں
رات کے پاس روز جاتا ہوں

رات کے پاس چاند تارے ہیں
صبح رکھتی ہے اوس کے موتی
تم بھی ہوتے ہمارے ساتھ اگر
زندگی یوں اُداس کیوں ہوتی

موڑ پر آکے رُک گئے ہیں قدم
اب کہاں جاؤں جی کو بہلانے
ایک جانب ہے مے پیالوں میں
ایک جانب نظر میں پیمانے

صبا سے پیالوں سے مرا ذکر نہ کرنا
گلیوں کے اُجالوں سے مرا ذکر نہ کرنا
یاد آئیں گے کھڑکی کی سلاخوں کو مرے لمس
تم سامنے والوں سے مرا ذکر نہ کرنا

ہر ایک روز ہی چھپتے ہیں سینکڑوں اخبار
ہزاروں درد، مگر کوئی دل نہیں روتا
یہ کیسا شہر ہے، یہ کون سا نگر کہ ہمیں
سڑک پہ لاش پڑی ہو تو غم نہیں ہوتا

کل کوئی صبح، جانے ہو کہ نہ ہو
آج کی شام بھی نہ کھو جائے
لا پلا جام، ڈر ہے یہ دُنیا
شب کی شب میں نہ ختم ہو جائے

بِردائے نُورِ تنے تو ہماری رات کٹے
جو آنچلوں سے چھَنے تو ہماری رات کٹے
بدن کی چاندنی ہونٹوں کی گل فشانِ شبنم
کسی کا ساتھ بنے تو ہماری رات کٹے

"صبا کے ہاتھ کی نرمی ہے اُن کے ہاتھوں میں"
سحر کی روشنی چہرے سے اُن کے ڈھلتی ہے
بدن کے لوچ میں شامل ہے موج موج ندی
خرام جیسے چراغوں سے لَو نکلتی ہے

درو دیوار نے ڈھونڈا ہے تجھے دیر تلک
چاند تاروں نے بہت دیر ستایا مجھ کو
کون دے گا مجھے پانی، مجھے دیکھے گا بتا
رات بھیگے ہوئے سبزے نے جگایا مجھ کو

کوئی برہن بہائے یوں آنسو
جیسے سچ مچ جھڑی ہو ساون کی
کوئی آنکھوں میں ڈال کر کاجل
راہ دیکھے پیا کے درشن کی

ہر کفِ گُل سے پھوٹتی ہوئی لَو
مہکی مہکی ہوئی چمن کی آگ
اُف صراحی میں تیرے جسم کا عکس
پی گئے ہم ترے بدن کی آگ

ہر ایک لمحہ گھُلا تمھاری غزل کے ساتھ
شباب و حُسن دُھلا تمھاری غزل کے ساتھ
ہزار رنگ بکھرنے لگے تھے خلوت میں
کسی کا جسم کھُلا تمھاری غزل کے ساتھ

کیف سے رات جھومتی ہے جب
اس طرح کوئی یاد آتا ہے
جیسے پچھلے پہر بیاباں میں
کوئی دلوانہ ھیر گاتا ہے

دِن ڈھلے اِک حسین دلہن یوں
اپنے جوڑے کا ھار بُنتی ہے
چاندنی رات جیسے کھیتوں میں
کوئی الھڑ کپاس چُنتی ہے

اِک جواں رات ساتھ لے کے چلے
گذرے لمحات ساتھ لے کے چلے
کہیں مل جائے تو ہمیں شاید
تیری ہر بات ساتھ لے کے چلے

جھک رہا ہے کنول پہ اِک بھونرا
بوئے فصلِ بہار سے مدہوش
جس طرح تیرے پائے رنگیں پر
تیرا عاشق ہو سرنگوں خاموش



اجیت سنگھ دیول

اجیت سنگھ دیول

آمد : قصبہ دھاندرہ (ضلع لدھیانہ) ۴/جولائی ۱۹۳۹ء

اجیت سنگھ دیول نام، اجیت تخلص، اپنے ننیہال کے گاؤں دھاندرہ، ضلع لدھیانہ میں پیدا ہوئے۔ اسکول تک کی تعلیم ڈی اے وی ہائی اسکول ساہیوال میں حاصل کی۔ اپنی لاپرواہیوں کی وجہ سے گریجویشن نہیں کر سکے اور ریلوے میں ملازم ہو گئے لیکن جلد ہی اُکتا گئے اور ملازمت چھوڑ کر بمبئی آگئے۔ اپنے بھائی دھرمیندر کی طرح اداکاری کے میدان میں قدم رکھا اور فلم 'عید کا سلام' 'کھوٹے سکّے' 'کچے ہیرے' 'ایک نظر' 'رئیس زادہ' اور دیگر فلموں میں مرکزی اور اہم رول ادا کئے۔ پنجابی فلم 'سنتو بنتو' کے ہدایتکار بھی تھے اور اس میں اداکاری بھی کی۔

اجیت سنگھ فلم نگار، فلم ساز اور نغمہ نگار بھی ہیں۔ ان کی کہانی پر بنی فلم 'پرتگیہ' سپر ہٹ ہے۔ وہ بطور فلم ساز اور ہدایتکار 'مہربانی' اور 'دیوتا' بنا چکے ہیں۔ وہ 'دیوتا' کے مصنّف اور نغمہ نگار بھی ہیں۔ علاوہ ازیں سنی سوپر ساونڈ کے مینجنگ ڈائرکٹر اور دیگر کئی کمپنیوں کے ڈائرکٹر ہیں۔ ویسے ان کا کہنا ہے کہ جب خالی بیٹھا رہوں تو کمائی ہی کمائی ہے اور کام کرنے لگتا ہوں تو نقصان ہی نقصان۔

اجیت سنگھ کے والد اسکول ٹیچر رہ چکے ہیں اور اُردو فارسی پر اچھی دسترس رکھتے ہیں۔ وہ اکثر اُردو اور فارسی کے اشعار سُنایا کرتے تھے جس کی وجہ سے اجیت سنگھ بچپن ہی سے شعری ذوق رکھتے ہیں۔ چونکہ اس زمانے میں پنجاب کا ماحول اُردو زبان اور شعر و سخن کے لئے از حد ساز گار تھا۔ اس لئے اجیت سنگھ نے بچپن ہی سے کلام کہنا شروع کر دیا۔ جو لدھیانہ کے ادبی جریدے 'پرواز' کے علاوہ دیگر رسالوں میں چھپتا رہا۔

اجیت سنگھ بنیادی طور پر صوفی منش ہیں اور شاعرانہ مزاج رکھتے ہیں۔ اُن کی نظموں، غزلوں، گیتوں اور قطعات کا مطالعہ کرتے وقت قاری کو یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ اپنی مٹّی کی خوشبو اور کائناتی سچّائیوں سے دوبارہ اپنا تعلق استوار کر رہا ہے۔ اُن کے کلام میں سادگی اور پرکاری ہے۔

تم کو ہو گر اجیت سے ملنا
میکدے میں وہ عام ملتا ہے

لب پہ تیرے گُل کی صباحت
آنکھ میں تیری پاک صداقت
تڑپ رہی ہے دل میں میرے
تجھ کو چھُو لینے کی چاہت

چودھویں رات کو غور سے دیکھئے
چاند رانجھا ہے تو چاندنی ہیر ہے
آتماؤں کا یہ ہے مقدّس مِلن
یہ جہاں میں محبّت کی تصویر ہے

چھَل چھَل چھلکی پریم کی چھاگل
ٹپ ٹپ ٹپکیں بوندیں نرمل
تم آئے تو ہو گئے جَل تھَل
رِم جِھم برسا پیار کا بادل

جِھلمل جِھلمل پریت کا آنگن
ساری دھرتی دربن دربن
مِلن کی رُت میں اور بھی نکھرا
سیل سجیلے رُوپ کا جوبن

باندھوں توبہ تو ہر سکوں جائے
توبہ توڑوں تو جام مِلتا ہے
تم کو ہو گر اجیت سے مِلنا
میکدے میں وہ عام مِلتا ہے



رضا بجنوری

رضاؔ بجنوری

آمد : شیر کوٹ، ضلع بجنور یکم جنوری ۱۹۴۰ء

سید حبیب الرّضا ہاشمی نام، رضاؔ تخلص، شیر کوٹ ضلع بجنور کے ایک معزز گھرانے میں پیدا ہوئے۔ آباد اجداد تیرھویں صدی عیسوی میں منگولوں کے حملوں کے سبب، تلاشِ معاش میں ہندوستان آئے اور یہیں آباد ہو گئے۔ اُنکے پر دادا سید عطا حسین ہاشمی غدر ۱۸۵۷ء کے وقت آگرہ کے کوتوال تھے۔ دادا سید رضا حسین ہاشمی اُن کے اکلوتے فرزند تھے اور بے پناہ علمی و ادبی ذوق رکھتے تھے۔ انہوں نے اپنا زیادہ تر مال و متاع حصولِ علم اور کتابیں خریدنے میں لگا دیا۔ وہ اپنے وقت کے بڑے انگریزی داں بھی تھے اور انہیں گورنر نے مسٹر کے خطاب سے سرفراز کیا تھا۔ اُن کے والد سید رؤف الرّضا ہاشمی نے خاندانی وراثت ہی پر صبر کیا۔

رضاؔ بجنوری کی ابتدائی عربی، فارسی اور اُردو تعلیم شیر کوٹ ہی میں ہوئی۔ اسکولی تعلیم اپنے چچا سید مسعود الرّضا ہاشمی کے زیرِ سایہ مراد آباد میں حاصل کی۔ اور پھر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے بی ایس سی کر کے ملازمت کے سلسلے میں بمبئی آ گئے۔ یہیں پہلے بزنس مینجمنٹ میں ڈپلومہ کیا اور پھر جوٗ لاجی میں ڈپلومہ کیا۔ ۱۹۷۹ء میں انڈین ٹریڈ سروس سے منسلک ہوئے اور ان دنوں جوائنٹ چیف کنٹرولر آف امپورٹس اینڈ ایکسپورٹس کے عہدے پر فائز ہیں۔

قیام علی گڑھ کے دوران اپنے ماموں ڈاکٹر خورشید الاسلام کے ساتھ ادبی کاموں میں مصروف رہے۔ ڈاکٹر صاحب ان دنوں 'ذکرِ میر' کا فارسی سے اُردو میں ترجمہ کر رہے تھے اور اکثر مسوّدے رضاؔ سے لکھواتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب فنِ تحقیق میں خداداد صلاحیتوں کے مالک ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے اقوامِ متحدہ کے ایک پراجکٹ پر رالف رسل کے ساتھ دیوانِ غالبؔ کا انگریزی ترجمہ کیا۔ اس دوران رضاؔ دہلی میں تھے اور اکثر ڈاکٹر صاحب اور رالف رسل کے مابین ادبی رابطہ بنائے رکھنے میں معاونت کرتے تھے۔

رضاؔ کا شعری ذوق دورانِ تعلیم بیدار ہوا۔ وہ غزل گوئی کی جانب راغب ہوئے اور دورانِ ملازمت بھی مشقِ سخن جاری رہی۔ قیامِ بمبئی کے دوران صابر دت سے ملاقات ہوئی اور اُن کی رہنمائی اور حوصلہ افزائی میں شاعری کا ذوق بڑھتا رہا اور انہوں نے رضاؔ کو اپنا کلام چھپوانے پر متوجہ کیا۔ رضاؔ کی زبان سادہ اور عام فہم ہے انہیں غزل گوئی کے علاوہ قطعات پر بھی اچھی قدرت حاصل ہے

سرِ محفل انھیں کیوں دیکھ کر دل شاد ہوتا ہے\
کہ جن کو نام بھی مشکل سے اپنا یاد ہوتا ہے

اُس کی مرضی سے الگ مذہب دالقاں کب تک
سُنوا اے واعظو یہ جنگ کا میداں کب تک
جاگو جاگو کہ ستاروں پہ ہیں دُنیا کے قدم
عقل کے دشمنو تم بیچو گے ایماں کب تک

ہم کثرتِ انوار سے گھبرائے ہوئے ہیں
وہ رُخ سے نقاب آج جو سرکائے ہوئے ہیں
بڑھتی ہی چلی جائے گی عشّاق کی وحشت
گیسو ترے شانے پہ جو بل کھائے ہوئے ہیں

حُسن بتاں کو دیکھ کے میں دنگ رہ گیا
حیرت کا میری آنکھوں میں اک رنگ رہ گیا
جس قافلے کے ساتھ تھا مجھ سا شکستہ پا
پیچھے وہ قافلہ کئی فرسنگ رہ گیا

خانقاہوں میں کسی کا بول اب بالا نہیں
سر تو سجدے میں ہے لیکن نور کا ہالا نہیں
کیوں ہوا خواہان دنیا کو ڈراتا ہے بہت
شیخ یہ ایمان ہے مکڑی کا کچھ جالا نہیں

سو مشکلیں تھیں عشق کے آزار کے لئے
ہموار راہِ شوق نہ تھی پیار کے لئے
آنکھوں میں انتظار کی بیتابیوں کے ساتھ
در پر کھڑے رہے ترے دیدار کے لئے

انور سدید
پی ایچ ڈی

۱۷۲، ستلج بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن
لاہور ۱۸

۱۲ر اکتوبر ۱۹۸۹ء

محبّی صابر دت صاحب،

تسلیمات! آپ کے فرستادہ "فن اور شخصیت" کے طرزؔ نمبر کے چار پرچے کوئی صاحب گھر پر پہنچا گئے، خوشی بھی ہوئی اور حیرت بھی۔ ایک روز پہلے آپ کا خط ملا تھا۔ اس میں ترسیل کی اطلاع نہیں تھی اتنا شاندار نمبر چھاپنے پر اور اتنے اچھے مضامین حاصل کرنے پر مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ گنیش بہاری طرزؔ صاحب میری توقع کے مطابق مجھے ایک زندہ کردار نظر آئے۔ ان سے فوراً غائبانہ محبت ہو گئی۔

آج کے "ڈان" میں آپ پر ایک خوبصورت آرٹیکل چھپا ہے۔ اتفاق کی بات یہ ہے کہ آج ہی گنیش بہاری طرزؔ صاحب پر میرا کالم بھی چھپا ہے۔ میں دونوں کی نقول ارسال کر رہا ہوں۔

خدا کرے آپ بعافیت ہوں۔ طرزؔ صاحب کو اور دیگر احباب کو میرا سلام کہیے۔

مخلص

انور سدید

کہتی ہے تجھ کو خلقِ خدا ....

گنیش بہاری طرزؔ نمبر

صابر دت نے گنیش بہاری طرز کی روپوش عظمت بازیافت کی

مجھے تو گنیش بہاری طرز سے اسی دن دلچسپی پیدا ہو گئی تھی جب مشفق خواجہ صاحب نے بتایا تھا کہ طرز کا تا حال کوئی شعری مجموعہ موجود نہیں اور صابر دت صاحب گنیش بہاری صاحب پر ایک خاص نمبر شائع کر رہے ہیں جس کی ضخامت قتیل شفائی نمبر سے کم نہیں ہوگی۔

میں نے پوچھا جب طرز صاحب کا مجموعۂ کلام ہی نہیں چھپا تو ناقدانِ ادب اُن پر اظہارِ خیال کس طرح کریں گے؟ مشفق خواجہ صاحب نے اس کا جواب نہیں دیا۔ اگلے خط میں گنیش بہاری طرز کی مٹھی بھر نظمیں اور غزلیں بھیج دیں اور لکھا کہ "بمبئی سے چلنے لگا تو صابر دت نے یہ چیزیں تحفتاً عنایت کی تھیں۔ میں یہ تحفہ اپنے پاکستانی دوستوں میں تقسیم کر رہا ہوں۔ قبول کیجئے اور مضمون لکھئے۔"

میں اچھی شاعری کے تعارف کے لئے شاعر سے ذاتی طور پر شناسائی کو ضروری نہیں سمجھتا۔ شاعر کی شخصیت درمیان میں سے منہا ہو جائے تو شاعری اپنا جوہر خود آشکار کرتی ہے اور پھر شاعر سے جو محبت بالواسطہ پیدا ہوتی ہے وہ دائمی بلکہ دیرپا ہوتی ہے۔ طرز صاحب کی مٹھی بھر شاعری کا گلدستہ خواجہ صاحب نے عنایت کیا تو فرمایا: "یہ غزلیں خود اپنے خالق کا تعارف کرائیں گی کچھ وقت ان غزلوں کے ساتھ گزاریئے" میں نے کچھ وقت طرز کی غزلوں کے ساتھ گزارا۔ وہ مجھے بنیادی طور پر "ڈان جوآن" کے عشق پیشہ آدمی نظر آئے۔ جو لمحے کی قید میں ہیں لیکن اس کی مسرت تیاگنے پر آمادہ نہیں۔ مجھے یاد ہے کہ اس بنیادی نقطے پر ہی میں نے اپنا مضمون باندھا تھا۔ اور جب مضمون خواجہ صاحب کو بھیج دیا تو مطمئن تھا کہ طرز صاحب اب میرے لئے اجنبی نہیں رہے تھے۔ اور ان کی غزلوں نے اپنے خالق کا شعری کردار مجھ پر آشکار کر دیا تھا اور اپنا تمام اسرار کھول دیا تھا۔

میں یہ واقعہ بھول گیا تھا اچانک اگلے روز ہندوستان سے ایک ضخیم بنڈل موصول ہوا۔ کھولا تو سامنے گنیش بہاری طرز صاحب اپنی سبھا جمائے بیٹھے تھے اور اس سبھا میں فراق گورکھپوری، پروفیسر ممتاز حسین، خواجہ احمد عباس، قرۃ العین حیدر، ظ انصاری، رضا کاظمی، عتیق احمد، سلمان اطہر جاوید، جگن ناتھ آزاد، عبدالقوی دسنوی، مظہر امام، حسن نعیم، عزیز قیسی، بشر نواز جیسے ممتاز لوگ موجود تھے اور گنیش بہاری طرز کے جام غزل سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ اس خوبصورت محفل کے ایک کونے میں یہ ناچیز انور سدید بھی گلیم پوش تھا اور اپنے دوستوں میں سے رام لعل، یوسف ناظم، ڈاکٹر داؤد کاشمیری، اجیت سنگھ دیول، سلمیٰ صدیقی اور ڈاکٹر شفیقہ فرحت کی بے تکلف باتیں سن رہا تھا اور وہ تصویر دیکھ رہا تھا جس میں گنیش بہاری طرز مہر رنگ رقیب سرو سامان نظر آتے ہیں۔ ایک تصویر میں طرز صاحب، محمد علوی اور صابر دت کے ساتھ محوِ کلام تھے۔ ایک اور تصویر میں وہ کشور ناہید سے باتیں کر رہے تھے۔ اور کشور ناہید ہمہ تن گوش نظر آتی ہیں۔ ایک محفل ادب میں طرز صاحب، راجندر سنگھ بیدی، راما نند ساگر، کرشن چندر، علی سردار جعفری، ساحر لدھیانوی، سلمیٰ صدیقی، جیندر ناتھ، خواجہ احمد عباس، رام لعل، ظ انصاری اور شہریار عابدی کے ساتھ شریک تھے۔ ان زعمائے ادب کے ساتھ وہ بھی زعیم نظر آتے ہیں۔ اس زعیم آدمی نے زندگی بھر ڈھنڈورے کی مصنوعی شہرت کو قبول نہیں کیا۔ تو مجھے یہ اُن کی عظمت نظر آتی ہے۔ صابر دت نے اس روپوش عظمت کو ہی بازیافت کیا ہے اور "فن اور شخصیت" کا گنیش بہاری طرز نمبر چھاپ کر ایک ایسی روایت قائم کی ہے جو تا دیر لا مثال رہے گی۔

یہ آخری بات میں نے اس لئے عرض کی کہ صابر دت نے اس سے پہلے جس معیار اور انداز کے خاص نمبر شائع کئے ہیں وہ منفرد بھی ہیں اور ممتاز بھی۔ اور یہ اتنے جاذب نظر ہیں کہ ہر زندہ شاعر آرزو مند ہے کہ صابر دت صاحب ایسا ہی ایک خوبصورت نمبر اس پر بھی مرتب کر ڈالیں۔ تاہم یہاں یہ بات لکھنا ضروری لگتا ہے کہ اب تک صابر دت کی نظر انتخاب ممتاز اور معروف ادبی شخصیات پر پڑتی رہی ہے۔ فیض احمد فیض، ساحر لدھیانوی، جاں نثار اختر، ہیندر ناتھ اردو ادب کی عہد ساز شخصیات ہیں۔ جن کے بارے میں عوام کو معلومات فراہم کرنا اور ادبا سے مضامین حاصل کرنا نسبتاً آسان ہے اور عالم یہ ہے کہ ان ادبا پر لکھنے والے غیر معروف بھی ہوں تو وہ معروف ہو جاتے ہیں۔ صابر دت کے یہ سب خاص نمبر اردو ادب کا قیمتی سرمایہ ہیں۔ لیکن اس کا خصوصی کارنامہ تو اب گنیش بہاری طرز نمبر کی صورت میں سامنے آیا ہے۔ جب اس نے ایک ایسے خادم ادب پر نمبر مرتب کر ڈالا جس سے عوام روشناس نہیں ہیں۔ چند خاصانِ ادب شناسا ہیں۔ تو ان سب کی ملاقات بھی نجی محفلوں تک محدود ہے۔ اس نمبر سے صابر دت نے روایت شکنی نہیں کی! اور فکر تونسوی، خواجہ احمد عباس، ڈاکٹر وزیر آغا، خدیجہ مستور جیسے نامور ادبا پر "فن اور شخصیت" کے خصوصی نمبر چھاپنے کا اعلان اس روایت ہی کی توسیع ہے۔ گنیش بہاری طرز نمبر چھاپ کر تو صابر دت نے ایک نئی اور روشن روایت کا آغاز کیا ہے۔ جس کی تحسین بھی کی جانی چاہیئے۔ اور اسے توسیع بھی ملنی چاہیئے کہ انہوں نے ایک کم نام شاعر کی نیک نامی کو طبقۂ عوام تک پہنچا دیا ہے۔

گنیش بہاری طرز نمبر کے سلسلے میں پاکستان میں مشفق خواجہ صاحب نے سب سے زیادہ دلچسپی لی ہے مجھے اس کا باعث سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ اب یہ نمبر چھپ کر آگیا ہے تو خواجہ صاحب کی دلچسپی کا اسرار بھی کھل گیا ہے۔ خواجہ صاحب کو بھی ان گلہائے شگفتہ سے پیار ہے جو شہرت عطا کرنے کے مراکز سے دور صحراؤں میں اُگتے ہیں اور گرد و پیش کو معطر کرنے کے بعد صحرا ہی میں گم ہو جاتے ہیں۔ خواجہ صاحب نے ایسے متعدد شعرا کو گوشۂ گمنامی سے نکال کر روشناس خلق کرایا ہے۔ جنہیں اردو ادب نے فراموش کر دیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ گنیش بہاری طرز کی عملی زندگی کے اس رویّے نے ہی مشفق خواجہ صاحب کو متاثر کیا ہوگا۔ نتیجہ یہ کہ صابر دت کے اس منصوبے کو پروان چڑھانے میں معاونت کرنے لگے۔ چنانچہ اس وقیع نمبر میں پاکستان کی نمائندگی پروفیسر ممتاز حسین، وزیر آغا، محمد رضا کاظمی، عتیق احمد، انتظار حسین، نظیر صدیقی نے کی تو اس میں مشفق خواجہ صاحب کی کوشش کا عمل دخل نمایاں نظر آتا ہے۔

رسالہ "فن اور شخصیت" کے گنیش بہاری طرز نمبر سے دیکھنا چاہیئے کہ ہمارے سامنے کیسا شاعر آتا ہے۔

فراق صاحب نے فرمایا ہے کہ طرز کی غزلیں ناکام شاعر کی غزلیں نہیں ہیں بلکہ سنجیدہ شاعر کی غزلیں ہیں۔ طرز کے کلام میں ہوس نہیں سکون پذیر لہریں ہیں۔ پروفیسر ممتاز حسین نے طرز کا یہ شعر سنایا۔

وقت ہے شاید ملن کا طرز پھر صدیوں کے بعد
مجھ سے کچھ کہنے لگی ہے خاموشی زنجیر کی

تو فیصلہ دیا کہ اس میں جو فلسفیانہ تعلق ہے وہ انہیں کا حصہ ہے۔ محترمہ قرۃ العین حیدر صاحبہ کی رائے میں طرز کی زبان عام فہم ہونے کے ساتھ اردو غزل کی شستہ، فنی روایات کی آئینہ دار بھی ہے۔ ایک پاکستانی ادیب کو طرز صاحب کی غزل کا جسم گلنار نظر آیا جو احساس کے صادق لہرے کو رگوں میں دوڑا دیتا ہے۔ ایک اور پاکستانی نقاد محمد رضا کاظمی نے دریافت کیا کہ جب آدمیان ہر طرز کی جدید حیثیت کے

پس پشت آجاتی ہے تو اس قسم کی تصویریں اُبھرنے لگتی ہیں ۔

گردش میں مے کے گردش ایام دسمبر ہے یوں
جیسے کسی بھنور میں بھنور ڈوبنے لگے

اِس نمبر کی اشاعت سے صابر دت نے یہ بات ثابت کردی ہے کہ گنیش بہاری طرز کی شاعری میں اتنی توانائی ہے کہ وہ ہند پاک دونوں ممالک کے ارباب فن سے خراج تحسین حاصل کر لے ۔ چنانچہ اب کل کا گمنام گنیش بہاری طرز آج کے ممتاز و معروف شعراء کی صف میں کھڑا ہے تو مجھے بے پایاں مسرت محسوس ہو رہی ہے ۔

ڈاکٹر انور سدید

روزنامہ حریت کراچی

صابر دت نے آزادی کے بعد اردو کی ادبی صحافت کی آبرو رکھی ہے

صابر دت اردو کے اُن چند مدیروں میں ہیں جنہوں نے آزادی کے بعد اردو کی ادبی صحافت کی آبرو رکھی ہے ۔ انہوں نے چند برس پہلے جب "فن اور شخصیت" کا جہندر ناتھ نمبر شائع کرنے کا پروگرام بنایا تو اُن کے بہی خواہوں اور دوستوں کو بھی یقین نہیں آیا کہ وہ اتنے بڑے پیمانے پر کسی فنکار کی شخصیت اور اس کے فن پر ایسا شاندار نمبر شائع کر سکتے ہیں ۔ جہندر ناتھ نمبر کے بعد جاں نثار اختر نمبر، غزل نمبر، فیض احمد فیض نمبر، قتیل شفائی نمبر، ساحر لدھیانوی نمبر، نرگس دت نمبر نے اردو دنیا میں دھوم مچا دی ۔

اس دفعہ صابر دت نے ایک نیا تجربہ کیا ہے انہوں نے ایک ایسے شاعر کے فن پر "فن اور شخصیت" کا نمبر مرتب کیا ہے جس کا خاص نمبر کی ترتیب کے وقت تک کتابی صورت میں مجموعۂ کلام بھی شائع نہیں ہوا تھا ۔ صابر دت نے گنیش بہاری طرز پر خاص نمبر مرتب کر کے بتایا ہے کہ شاعر کو اس کے چھپے ہوئے مجموعۂ کلام پر یا کلام کے مجموعوں کی تعداد کے گز سے ناپنا کسی طرح بھی مناسب نہیں ۔

اس خاص نمبر میں طرز کی غزلوں اور نظموں کا انتخاب شامل کیا گیا ہے ۔ اس انتخاب کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ طرز ایک گمنام فنکار ضرور ہیں لیکن بے جان نہیں ۔ چونکہ وہ بہت بڑے سرکاری عہدے پر فائز رہے ہیں اس لئے انہیں اتنی شہرت اور مقبولیت کے مختلف طریقے استعمال کرنے کا موقع نہیں ملا یا ممکن ہے کہ سستی شہرت حاصل کرنے کے لئے جدوجہد کرنا اُن کا مزاج نہ ہو ۔ بہرحال اُن کے کلام سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کلاسیکی روایت کے شاعر ہیں ۔ اور بقول ڈاکٹر وزیر آغا ان کے اسلوب کی پختگی اور شعری رویے میں توازن اور اعتدال کا احساس ہوتا ہے ۔ طرز کے حساس ذہن نے اپنے گرد پھیلی ہوئی زندگی کو بہت قریب سے دیکھا ہے ۔ انہوں نے اپنے احساس جذبے اور فکر کو کلاسیکیت کے سانچے میں ڈھال کر پیش کیا ہے ۔ ان کے اشعار محض تک بندی نہیں بلکہ اُن کی اصل زندگی کے ترجمان ہیں ۔ یہ اور بات ہے کہ ان کے اشعار کے مطالعے سے میرے ذہن پر پہلا تاثر یہ قائم ہوا کہ وہ لفظیات کے تکلفات سے یا دوسرے لفظوں میں زبان کی بازیگری سے دامن بچاتے ہیں ۔ سیدھی سادی زبان میں اپنی بات کہہ دیتے ہیں ۔ یعنی آورد کے چکر میں نہیں پڑتے ۔ اور بہت گہری فلسفیانہ باتیں بھی نہیں کرتے ۔ ان کے موضوعات تو عام انسان کے دکھ درد ہیں ۔ بڑی بات یہ ہے کہ وہ کسی ایسے ادبی گروہ سے تعلق نہیں رکھتے جس کی بنیاد مخصوص نظریات پر ہوتی ہے ۔ اسی لئے ان کے ہاں انسانی محبت اور خلوص کی فضا ملتی ہے ۔

آخر میں یہ تین شعر ملاحظہ ہوں، ان میں کلاسیکیت اور جدیدیت کا کیسا حسین امتزاج ہے۔ ان اشعار میں فلسفہ ہے لیکن پیچیدگی کے ساتھ نہیں۔ سیدھے سادے انداز میں زندگی کی حقیقتوں کو پیش کر دیا گیا ہے۔ اب وہ شعر ملاحظہ ہوں ؎

دوستی اپنی جگہ اور دشمنی اپنی جگہ فرض کے انجام دینے کی خوشی اپنی جگہ
پتھروں کے دیس میں شیشے کا ہے اپنا وقار دیوتا اپنی جگہ اور آدمی اپنی جگہ
گیان مانا ہے بڑا بھگتی بھی لیکن کم نہیں آگہی اپنی جگہ ، دیوانگی اپنی جگہ

"فن اور شخصیت" کے ایسے خوب صورت نمبر کے لئے طرز صاحب اور صابر دت صاحب دونوں کو مبارکباد دیتا ہوں۔

ڈاکٹر خلیق انجم   "ہماری زبان" نئی دہلی

صابر دت خود بھی ایک علیحدہ نمبر کے مستحق ہیں

آزادی ملنے کے بعد ہندوستان میں اردو زبان کو کن دشوار اور کٹھن منازل سے گزرنا پڑا ہے اگر اس کی داستان لکھی جائے تو اسے بیان کرنے کے لئے کئی صفحات درکار ہوں گے۔ چنانچہ ایسے حوصلہ شکن ماحول میں "فن اور شخصیت" جیسے ضخیم رسالے کا تعین مدت کے بغیر منظر عام پر آنا ایک غیر معمولی بات ہے۔ "فن اور شخصیت" کے مدیر صابر دت صاحب سے میں بمبئی میں اپنے نوجوان دوست پروفیسر ظہیر علی کے فلیٹ پر دو تین مرتبہ مل چکا ہوں۔ صابر دت خود ایک شاعر ہیں اور ادب پر گہری تنقیدی نظر رکھتے ہیں۔ اس طرح میری رائے میں وہ خود بھی "فن اور شخصیت" کے ایک علیحدہ نمبر کے مستحق ہیں۔ مگر میں نے محسوس کیا ہے کہ انہیں اپنی ادبی شخصیت کو منوانے سے زیادہ دوسرے جانے مانے ادبا اور شعراء کے فن اور شخصیت کو اردو دنیا سے متعارف کرانے کی فکر لگی رہتی ہے۔

"فن اور شخصیت" کا دسواں شمارہ گنیش بہاری طرز نمبر دیکھنے کے بعد حیرت ہوتی ہے کہ صابر دت صاحب نے نسبتاً ایک غیر معروف شاعر کا خصوصی نمبر شائع کرنے کا فیصلہ کیسے کر لیا۔ غیر معروف ان معنی میں کہ گنیش بہاری طرز صاحب کا ایک بھی مجموعۂ کلام ابتک شائع نہیں ہوا ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ خود میں، فن اور شخصیت کے اس نمبر کے ذریعہ پہلی بار گنیش بہاری طرز کی شخصیت اور ان کے کلام سے واقف ہوا ہوں۔ صابر دت صاحب نے ایک جگہ لکھا ہے کہ گنیش بہاری طرز اور ان کی دوستی پندرہ سال پرانی ہے اور اپنے مختصر مضمون میں انہوں نے طرز صاحب کی دریا دلی اور مہمان نوازی کا ذکر بھی کیا ہے مگر محض دوستی، ایک ضخیم نمبر کی بنیاد تو نہیں بن سکتی۔ بقول ڈاکٹر انور سدید "میں اچھی شاعری کے تعارف کے لیے شاعر سے ذاتی شناسائی کو ضروری نہیں سمجھتا۔" گویا طرز صاحب کی اچھی شاعری نے فن اور شخصیت کے مدیر کو ایک خصوصی نمبر شائع کرنے پر اکسایا ہے۔

چونکہ میں طرز صاحب سے نہیں ملا ہوں اور نہ ہی اب تک ان کا کلام پڑھنے کا موقع ملا ہے اس لئے اُن کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں ان کے شناساؤں اور دوسرے ادیبوں کے مضامین پڑھنے کے بعد ہی واقف ہو سکا ہوں۔ یا پھر خود طرز صاحب کے اس قطعہ سے اُن کے مسلک کا اندازہ ہوتا ہے۔

خادمِ اردو زباں ہوں شاعری مکتب میرا اور بھی رشتے ہیں لیکن دوستی مذہب میرا

لکھنؤ میرا وطن ہے اور بمبئی میرا نصیب طرزؔ کہتے ہیں مجھے سب میکشی مشرب میرا

تقریباً تین سو صفحات (بشمول پیغامات اور آراء) کے اس نمبر میں اردو کے جانے مانے ادیبوں اور نقادوں (ڈاکٹر ظ انصاری ڈاکٹر راہی معصوم رضا، ڈاکٹر انور سدید، پروفیسر ممتاز حسین، قرۃ العین حیدر) نے گنیش بہاری طرزؔ کی شخصیت اور فن کے بارے میں مضامین تحریر کئے ہیں۔ علاوہ ازیں اس نمبر میں چھوٹی بڑی ملا کر لگ بھگ چالیس بلیک اینڈ وہائٹ تصاویر بھی شامل ہیں۔ ایک تصویر میں طرزؔ صاحب کو یوگا کے مخصوص آسن میں دکھایا گیا ہے۔ گروپ تصاویر پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بمبئی میں مقیم بیشتر ادبا اور شعراء کے علاوہ فلمی شخصیتوں سے بھی طرزؔ صاحب کے مراسم ہیں۔

ایسا لگتا ہے کہ ریٹائرمنٹ کے بعد اپنے وطن لکھنؤ کو لوٹنے کی بجائے طرزؔ صاحب نے بمبئی کو اپنا مستقل مسکن بنا لیا ہے کیوں نہ ہو بمبئی کا جادو ہی کچھ ایسا ہے کہ جو کبھی شمال کی طرف سے نربدا پار کر کے بمبئی آیا یہیں کا ہو گیا۔ علی سردار جعفری صاحب کا ایک شعر ہے ؎

نہ جانے کیا کشش ہے بمبئی تیرے شبستانوں میں
کہ ہم شام اودھ صبح بنارس چھوڑ آئے ہیں

چونکہ گنیش بہاری طرزؔ کا کوئی مجموعۂ کلام ابھی تک شائع نہیں ہوا ہے، اس لئے اُن کی شاعری کے بارے میں فن اور شخصیت میں شامل شعری تخلیقات کو سامنے رکھ کر ہی کوئی رائے قائم کی جا سکتی ہے ان کا پورا منتخب کلام دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلا حصہ منتخبہ غزلیات کے لئے اور دوسرا حصہ فلموں کے لئے مختص ہے۔ مگر غزلوں ہی سے طرزؔ صاحب کے مخصوص لہجہ کا پتہ چلتا ہے۔ عزیز قیسی صاحب نے اپنے مضمون میں طرزؔ صاحب کی غزلوں کے آہنگ اور موسیقیت کا تجزیہ کرتے ہوئے اُن کی مترنم طرزوں کے ساتھ ان راگ راگنیوں کی بھی نشاندہی کی ہے جس میں کسی مغنیہ سے انہوں نے طرزؔ صاحب کی کچھ غزلیں سنی تھیں۔ عزیز قیسی لکھتے ہیں کہ طرزؔ صاحب خوش گلو ہونے کے ساتھ ساتھ فن موسیقی میں بھی درک رکھتے ہیں جیسا کہ اُن کے ابتدائی حالات سے معلوم ہوتا ہے۔ موسیقی کا ذوق انہیں اپنے والد سے ورثہ میں ملا ہے۔ ان کے والد رادھے بہاری لال سریواستو ریڈیو آرٹسٹ تھے۔ وہ گاتے اور نوشادمی بجاتے۔ ایک جگہ طرزؔ صاحب لکھتے ہیں "میں نے میوزک کالج میں تھرڈ ایر تک موسیقی کا درس لیا البتہ ریاض کی کمی کے سبب طبلہ سے مار کھا گیا۔ لہٰذا گلوکار، شاعر بن گیا۔

کسی مضمون نگار نے طرزؔ صاحب کی شاعری کے تعلق سے لکھنوی لب و لہجہ کی بات کہی ہے۔ میں سمجھتا ہوں لکھنؤ اور دہلی کے ادبی دبستانوں کا ذکر اسی وقت اپنے اندر کچھ مفہوم رکھتا تھا جبکہ ایک طرح کے سیاسی زوال کے باوجود لکھنؤ اور دہلی کے درباروں نے اردو شعرا کی سرپرستی کی تھی۔ مگر آزادی کے بعد سے بڑے پیمانہ پر انتقال آبادی کے باعث ان دونوں شہروں کا کیریکٹر بالکل بدل چکا ہے۔ اور آج کا لکھنؤ جو اتر پردیش سرکار کی راجدھانی ہے۔ اردو مخالفت مہم میں سب سے آگے دکھائی دیتا ہے۔ گنیش بہاری طرزؔ کا تعلق ماقبل تقسیم پیڑھی سے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی اردو کی میراث کو بچا کر لے آئے ہیں۔

اس کے باوجود کہ میں آزادی کے بعد کی غزلیہ شاعری کے ایک بڑے حصہ کو بھی اردو کی اچھی اور نمائندہ شاعری تسلیم نہیں کرتا۔ کبھی کبھار غزل کے اچھے اشعار پڑھنے کو مل جاتے ہیں۔ اس طرف بیس پچیس سال کے دوران غزلیہ شاعری کا جو احیاء ہوا ہے اس کے کئی اسباب ہیں جن کے بارے میں بحث کی فی الحال گنجائش نہیں ہے۔

فراق گورکھپوری نے اپنی اردو غزل کو ہندی الفاظ کے ذریعہ جو نیا آہنگ بخشا تھا، اس کا اثر گنیش بہاری طرز کے ہاں بھی نمایاں ہے مثلاً غزل کے یہ اشعار ــ

گیان مانا ہے بڑا شکتی بھی لیکن کم نہیں آگہی اپنی جگہ دیوانگی اپنی جگہ

موہ سو بھاؤک ہے اس مایا بھرے سنسار میں پیار جوگی سا مگر کرنا یہاں سنسار یو

نس نس میں اتری ہے ایسے اسکے انگن کی خوشبو ویران ہوئے گھر میں جیسے اے طرز سہاگن کی خوشبو

اسی زمین میں طرز صاحب نے اور بھی اچھے اشعار کہے ہیں :

کلی والے ہر موسم کا قدرت ہی پتہ دیتی ہے کوئل کی کوک سے ملتی ہے دھرتی کو ساون کی خوشبو

گیتا ہے تپسیا جیون کی اے طرز سپھل ہو جائے گی آتی ہے اس کی سانس سے اس بار سمرن کی خوشبو

گنیش بہاری طرز کی نظموں کو پڑھنے کے بعد مجھے ایسا لگا کہ طرز صاحب کی شاعری کا اصل میدان نظم نہیں بلکہ غزل ہے۔ غزل جو کہ شعر غنائی کی ایک صنف ہے۔ غزل جس میں فنون عشقیات کو بدرجہ اتم سمو دیا جاتا ہے۔

یہ ممکن نہیں کہ کوئی شاعر لکھنؤ کے ماحول میں پلے بڑھے اور اس نے میر انیس کے مرثیوں اور لکھنؤ کی عزاداری کی مجلس کا اثر قبول نہ کیا ہو۔ طرز صاحب نے بھی ایک نظم "حسینیت کا سایہ" لکھی ہے مگر اس میں مرثیہ کی وہ فضا نہیں ملتی جو کہ مرثیہ کے لئے مخصوص ہے

بہرکیف گنیش بہاری طرز کا کلام جیسا کہ فن اور شخصیت کے مشمولات سے پتہ چلتا ہے۔ ایسا ہے کہ اس کو ایک باذوق قاری نظر انداز نہیں کر سکتا۔

ڈاکٹر صفی الدین صدیقی

"سیاست" (حیدر آباد)

صابردت کی جمالیاتی ذہانت ان کی ادارتی صلاحیت کی پہچان ہے

"فن اور شخصیت" اپنی ضخامت کے لحاظ سے، آزادی کے بعد کے ہندوستان میں اردو کی لاغری کی تکبیر ہے۔ اس خوب صورت گیٹ اپ کے رسالے کے مالک و مدیر صابر دت ہیں جو ہر شمارے کو کسی ایک شخصیت سے منسوب کر کے اس کے فن اور سوانح کا جائزہ پیش کرتے ہیں۔ افسانہ نگار مہندر ناتھ سے نئے شمارے کے شاعر گنیش بہاری طرز تک رسالہ "فن اور شخصیت" کے اب تک دس نمبر شائع ہو چکے ہیں۔ ان میں فیض، ساحر، جاں نثار اختر، آپ بیتی اور غزل نمبر اپنے وزن اور معیار کے ساتھ ہند۔ پاک کے ادبی حلقوں میں کافی مقبول و متعارف ہیں۔

مدیر فن اور شخصیت کی انتخابی جہت سے اختلاف کی گنجائش بھلے ہی نکلے، لیکن ان شماروں کی طباعت، کتابت اور تزئین کی سلیقہ مندی نے برصغیر میں اپنے مخصوص معیار کا اعتبار مزید قائم کیا ہے۔ صابر دت کی یہی جمالیاتی ذہانت ان کی ادارتی صلاحیت کی پہچان ہے۔

صابر دت اچھے بُرے، پاپولر اور سنجیدہ ادب کی خانہ بندی کے قائل نہیں ہیں۔ ان کا مدیرانہ مزاج جمہوری ہے۔ وہ اردو کے ایسے پرستار ہیں جو اردو رسم الخط میں لکھی ہوئی ہر تحریر کو تنقیدی امتیازات سے دور ہو کر ادب کے زمرے میں شامل کرنے پر بضد ہیں۔

وہ اردو ادب میں ایسے گھاٹ کے معمار ہیں جہاں شیر کے ساتھ بکری اور گدھے کے ساتھ گھوڑے کی مساوی تہذیب نمایاں ہے اُن کے اس کشادہ رویے نے عوام و خواص کے ہر حلقے میں اُن کے رسالے کی مقبولیت میں اضافہ بھی کیا ہے۔ اس میں لکھنے والوں، اور اس کے پڑھنے والوں کی تعداد بھی اسی لئے دوسرے ادبی پرچوں کے برعکس زیادہ وسیع جغرافیہ لئے ہوئے ہے۔ وہ پڑھنے والوں پر اپنی رائے تھوپنے کے بجائے، پڑھنے والوں کی سوجھ بوجھ پر زیادہ بھروسہ رکھتے ہیں۔ نہ وہ فیض احمد فیض کے مداحوں سے نہ قتیل شفائی کو پسند کرنے کا اصرار کرتے ہیں اور نہ ساحر اور جاں نثار اختر کے قارئین کو گنیش بہاری طرز کے مطالعہ پر مجبور کرتے ہیں۔

مہندر ناتھ نمبر سے گنیش بہاری طرز نمبر تک، ایڈیٹر صابر دت نے ایک طویل ادارتی سفر طے کیا ہے۔ اس سفر کے اہم موڑ وہ مالی دشواریاں ہیں، جو ہر شمارے کے ساتھ اُن کے معاونین اور مخالفین کی ہر بار نئی فہرست مرتب کرتی ہیں۔ ان کی دوستی اور دشمنی کی واحد کسوٹی برسوں سے فن اور شخصیت کی اشاعت ہے۔ ان کی منزل رسالے کی اشاعت ہوتی ہے۔ جو اس کار خیر میں ہاتھ بٹاتا ہے دوست کہلاتا ہے جو اس کے آڑے آتا ہے، دشمن قرار پاتا ہے۔ مقصد کی اس لگن اور دیوانگی نے انہیں اردو اور غیر اردو دونوں حلقوں میں قابلِ توجہ بنا دیا ہے۔ اس طویل صحافتی تگ و دو میں انہوں نے جہاں کچھ خصوصی شماروں کے ذریعہ رسالہ کو ادبی معیار دیا ہے وہاں دیگر اشاعتوں سے اس کی تجارتی سطح کو ہموار کیا ہے۔

موجودہ شمارہ گنیش بہاری طرز کی شاعری اور شخصیت پر ہے۔ غالب سے صابر تک ہر انتخاب رسوائی کا باعث ہی ہوا ہے۔ غالب نے اپنے شعروں کا انتخاب کر کے رسوائی مول لی اور صابر نے ایک گم نام شاعر کو اپنے رسالے کے خصوصی نمبر کے لئے منتخب کر کے اپنی ساکھ کو داؤ پر لگایا ہے۔ جو وہ اب سے پہلے بھی کئی بار کر چکے ہیں ـــ وقت نے غالب کے انتخاب کی رسوائی کو نیک نامی میں بدل دیا۔ شاید گنیش بہاری طرز کا انتخاب بھی جو آج کچھ لوگوں کو اکھر رہا ہے، کل صابر کے اعزازات میں شمار ہو ..... ادبی تاریخ ایسے معجزات سے بھری پڑی ہے ـــ یوں بھی آج کے اشتہاری دور میں خرد کو جنوں کا نام دینا اور جنوں کو خرد ثابت کرنا کوئی ایسی مشکل کرشمہ سازی بھی نہیں۔

گنیش بہاری طرز نمبر میں ڈاکٹر گیان چند نے اپنے مراسلہ میں "یہ کون صاحب ہیں" لکھ کر طرز کے نام کے آگے سوالیہ نشان لگایا ہے اور پھر مشورہ دیا ہے کہ ایسے شخص کا خصوصی شمارہ نکالنے سے رسالہ کا اعتبار کم ہو جائے گا۔ انہیں کے ساتھ ڈاکٹر حامدی کاشمیری نے بھی سوال اٹھایا ہے۔ "کیا موصوف کا کلام اتنا وقیع ہے کہ اس پر فن اور شخصیت جیسے رسالہ کا نمبر نکالا جائے۔

اِن جیسے اور کئی سوالوں کے مقابلے میں جو جوابی مضامین اور رائیں طرز کی شاعری اور شخصیت پر اس شمارہ میں شامل ہیں، ان کے لکھنے والوں کے کچھ نام یوں ہیں۔ پروفیسر ممتاز حسین (کراچی) گوپی چند نارنگ، خواجہ احمد عباس، قرۃ العین حیدر، انور سدید، وزیر آغا، راہی معصوم رضا، ظ انصاری، سلمیٰ صدیقی، مشفق خواجہ، جگن ناتھ آزاد..... ظاہر ہے کہ ان ناموں کی شمولیت، کسی بھی رسالے کے ادبی اعتبار اور مذکورہ شاعر کے کلام کے وقیع ہونے کا ثبوت ہے۔

جگن ناتھ آزاد نے جس شاعر کو صاحب طرز کہا ہے۔ ممتاز حسین نے جس کی غزلوں کو بالکل نئے انداز کا حامل بتایا ہے

سلمیٰ صدیقی نے جس کو فطرتاً اور مزاجاً شاعر بتایا ہے، وزیر آغا نے جس شاعری میں زمانہ کے میلانات کو کلاسیکیت کے جامِ جہاں نما میں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ رام لعل نے جس کے شعری حسن کر اُس کے دائرۂ فکر کی تخلیقیت کو سراہا ہے۔ اس شاعر کے اس شمارہ میں شامل کچھ نمائندہ اشعار، جو مختلف غزلوں سے بنا کسی کوشش کے لئے گئے ہیں اس طرح ہیں۔ ان اشعار سے طرز کی طنزیہ شاعری کا سراغ ہی نہیں ملتا، ناقدین کی تنقیدی بصیرت سے بھی فیضیاب ہونے کا موقعہ ہاتھ آتا ہے۔ یہاں یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ اچھی تنقید شہرت سے زیادہ تخلیق کے معیار سے سروکار رکھتی ہے اور دیانت داری اس کی کسوٹی ہے۔

حسب توفیق ہی ملتا ہے یہ مانا ساقی حُسن کا جام نہ دے آنکھوں کے پیمانے دے

میں کہ جتنا اسے مناتا ہوں وہ کہ اتنا ہی مجھ سے روٹھے ہے

اتنا سکون دنیا کے سائے نہ دے سکے جتنا سکوں ملا تیری زلفوں کے سائے میں

پلائی ہے تو زمانے سے بے خبر کر دے نگاہِ مست بھی کر دے شراب میں شامل

اس شاعری میں بیشتر ناقدین نے کلاسیکی رکھ رکھاؤ کا دیدار بھی کیا ہے۔ یہ بات اور ہے کلاسک کی اصطلاح کو جان بوجھ کر یا مصلحتاً طرز کے مداحوں نے جس معنی میں استعمال کیا ہے وہ اپنے اصل معنی سے اتنی ہی دور ہے جتنی پیشہ ور ناقد سے سخن فہمی۔ مولوی عبدالحق نے اپنی لغت میں اس اصطلاح کے جو معانی دئے ہیں اُن میں سے کچھ یوں ہیں۔ . . . مستند، مسلّم، فصیح، اعلیٰ درجہ کا ادبیاتِ عالیہ وغیرہ . . . .

طرز لکھنوی تہذیب کی نمائندہ شخصیت ہیں۔ اُن کی خود کی رائے ناقدین کے بارے میں اسی تہذیب کی آئینہ دار ہے۔ اپنے ناقدین کے بارے میں اُن کے الفاظ یوں ہیں:

"ہر فنکار کو نقاد فن کی تنقید کو سر آنکھوں پر رکھنا چاہیئے کیونکہ نقاد کی نظر پوری صدی پر ہوتی ہے۔" (گنیش بہاری طرز نمبر ص۵۹)

طرز جو سلمیٰ صدیقی کے لفظوں میں فطرتاً اور مزاجاً شاعر ہیں، اپنی شاعری کو خداداد صلاحیت سے تعبیر کرتے ہیں اس صلاحیت کو وہ علم اور مطالعہ سے میلا کرنے کے حق میں نہیں ہیں (صفحہ ۱۲۶) وہ بھکتی کال کے سنت کوی کبیر کی طرح ذات میں ہی کائنات کے متلاشی ہیں۔ کبیر کے عہد کے تہذیبی تناظرات اور موجودہ صنعتی نظام میں جو زمانی و مکانی فرق ہے اس کا تجزیہ اُن کے تخلیقی مزاج کا حصہ نہیں ہے اس رویہ نے اُن کی شاعری کو عام فہم اور مقبول بنا دیا ہے۔ مانوس زبان، جانے پہچانے موضوعات اور شراب و شباب کی سرشاری نے طرز کی غزلوں کو احترامِ بزرگاں کا روشن استعارہ بنا دیا ہے۔

گنیش بہاری طرز نمبر جو تین سو ۳۰۰ صفحات پر مشتمل ہے، گنیش اور ان کے دوستوں کی کئی تصاویر سے آراستہ ہے اس میں گنیش بہاری طرز کا سارا غیر مطبوعہ کلام بھی شامل ہے۔

فن اور شخصیت کے اس نئے شمارے کے لئے مدیر صابر دت اور ڈاکٹر گوپی چند نارنگ واقعی مبارکباد کے مستحق ہیں جن کی تنقیدی و ادارتی کوششوں نے ایک گمنام شاعر کو اردو دنیا سے متعارف کرایا ہے۔

ندا فاضلی بمبئی

اُردو ادبی دُنیا کے سامنے ایک عمدہ مثال

لاہور کے محمد طفیل کے مقابلے میں ہمارے پاس غالباً صابر دت ہی ایک شخص ہے جس نے فن اور شخصیت کے مہندر ناتھ، جاں نثار اختر، قتیل شفائی، فیض احمد فیض، نرگس دت اور ساحر جیسے ضخیم نمبر پیش کئے ہیں۔ اور اب ایک اور نمبر سامنے ہے۔ "گنیش بہاری طرز نمبر" ایسے غیر معروف شاعر پر اتنا ضخیم نمبر۔ میرے خیال میں تو اتنی ہمت لاہور کے محمد طفیل نے بھی نہیں کی ہوگی۔ یہاں تو بڑے بڑے ادبا اور شعراء کے ساتھ بھی اردو والوں کا جو طرز عمل ہے وہ کچھ ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔
گنیش بہاری طرز نمبر کے شروع میں صابر دت کا ایک شعر ہے ؎

وقت کے حیرت کدے میں کیا ہے لمحوں کی بساط
مَیں نے جس کو چھو لیا وہ جاوداں بنتا گیا

اب گنیش بہاری طرزؔ اگر اردو ادب میں جاوداں بنتے ہیں تو اپنی شاعری کے باعث یا صابر دت کی وجہ سے اس کا فیصلہ بہرحال وقت کرے گا۔ مگر یہ نمبر ہے معرکہ کی چیز کیونکہ گنیش بہاری طرزؔ کا ابھی تک مجموعہ کلام بھی شائع نہیں ہوا ہے۔

گنیش بہاری طرزؔ کا کلام خود اُن کی زبانی دو تین مرتبہ سنا بھی ہے۔ اپنے پرچے میں ان کو چھاپا بھی ہے اور یہی محسوس کیا ہے کہ وہ غزل کے شاعر ہیں۔ زبان اُن کے گھر کی باندی ہے۔ پرانی نسل کی تمام ترخصوصیات انہوں نے اپنے اندر سمولی ہیں لیکن ظاہر ہے کہ نئی نسل کے نئے مسائل ہیں۔ حالات وہ نہیں ہیں۔ موضوعات مختلف ہیں۔ طرزؔ کے یہاں البتہ موضوع خارجی حقیقت سے تعلق رکھتا ہو یا داخلی سے وہ ہمیں اس کا راست عکس دکھاتے ہیں۔ درمیان سے پردے ہٹاتے ہیں۔ وہ بڑی حد تک کامیاب ہوئے ہیں۔ جیسے ؎

برق بھی گُل بھی آگ بھی جل بھی سامنے بھی اور اوجھل بھی
یہ بھی وہ بھی اور نہیں بھی حد ہوتی ہے چھل کی بھی

گنیش بہاری طرزؔ جو کہ نہ تو کسی نئے نظریئے کے مُربّی ہیں نہ ہی کسی خاص نظریئے سے انہیں لگاؤ ہے نہ بیزاری سیدھی سچی شاعری کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری بھری دھوپ میں بیلوں کی ہلکی ہلکی چھاؤں کی طرح محسوس ہوتی ہے۔ گنیش بہاری طرزؔ نمبر ایک خوبصورت نمبر ہے جس کے مضامین ہند و پاک کے نامور ادیب ممتاز حسین، قرۃ العین حیدر، عزیز قیسی، انور سدید، حسن نعیم، راہی معصوم رضا، مظہر امام وغیرہ کی کاوشوں سے تیار ہوئے ہیں۔ ان مضامین کے مطالعہ سے گنیش بہاری طرزؔ کی شخصیت اور شاعری کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ بعض مضامین بہت خوب ہیں۔ جیسے عزیز قیسی کا مضمون "شعر کی اپنی جگہ ہے طرزؔ کی اپنی جگہ"

اس نمبر میں طرزؔ کے ساتھ ان کے ہم عصروں کی تعداد بھی شامل ہیں۔ اور پھر طرزؔ کا تمام تر کلام بھی۔
ایسا نمبر نکالنا محنت طلب کام ہے۔ اور غالباً اردو ادبی دنیا کے سامنے ایک عمدہ مثال بھی ہے اور مردہ پرستی اور شہرت پرستی کی راہ سے انحراف بھی۔ اس نمبر کو خرید کر پڑھنے کی سفارش کی جاتی ہے۔

فیروزہ فیاض خان — "قومی راج" (بمبئی)

عبدالقوی دسنوی

بھوپال

عزیز محترم صابر دت صاحب — آداب!

میرے خط کے جواب میں "فن اور شخصیت" کا گنیش بہاری طرزؔ نمبر ملا۔ بے حد خوشی ہوئی کہ آپ اس بار پھر کامیاب اور کامران منزل پر پہنچے۔ حالانکہ محسوس کچھ ایسا ہو رہا تھا کہ طرزؔ نمبر کے پیش کرنے میں بڑی دشواری کا سامنا ہوگا۔ لیکن آپ میں قدرت نے ایسی صلاحیت عطا کی ہے کہ جس نمبر کو آپ ہاتھ لگاتے ہیں، وہ بہتر اور خوب صورت بن کر سامنے آتا ہے۔

طرزؔ نمبر دیکھا، کئی مضامین پڑھ ڈالے۔ ہر اعتبار سے یہ نمبر مفید، معیاری اور بہت خوب ہے۔ طرزؔ صاحب کو میری طرف سے مبارک باد کہیے۔

اب کس خوش نصیب کا نمبر نکالنے کا خیال ہے۔ ایک نمبر ہندوستانی ادیبوں کے لئے "ہندوستانی ادیب نمبر" کے نام سے مخصوص کیجئے۔ تاکہ دوسروں کو اندازہ ہو کہ ہندوستان میں اردو کا حال کیا ہے اور یہاں کے ادیب کیسے کیسے ادبی کام انجام دے رہے ہیں۔

"چند تصویر بتاں" کی اشاعت کس منزل میں ہے؟ اس میں کیا کیا ہے۔

ایک بار پھر طرزؔ نمبر کے لئے مبارکباد قبول کیجئے۔

آپ کا

عبدالقوی دسنوی

تاراچرن رستوگی

گوہاٹی

مشفقم صابر صاحب، خلوص و نیاز

"فن اور شخصیت" کا گنیش بہاری طرزؔ نمبر اردو شعری ادبیات میں قابل قدر اضافہ ہے۔ معیاری مضامین سے بھرپور اور جمالیاتی خوبیوں کا آئینہ دار یہ دستاویز آپ کے درج ذیل شعر کی ترجمان ہے ؎

وقت کے حیرت کدے میں کیا ہے لمحوں کی بساط — میں نے جس کو چھو لیا وہ جاوداں بنتا گیا

فی الواقع آپ کے شعر نے طرزؔ کو جاوداں بنا دیا ہے، آپ ایسا مدیر اردو کو ملا ہوا ہے یہ خوش بختی کی بات ہے مبارکباد قبول فرمائیں۔

خلوص کار

تاراچرن رستوگی

فارم نمبر ۴ بابت ملکیت وغیرہ

• مقامِ اشاعت : "پرچھائیاں" اے۔ بی نائیر روڈ، جوہو چرچ، بمبئی ۴۹ ۴۰۰۰

• میعادِ اشاعت : ششماہی • پرنٹر پبلشر : صابر دت ایڈیٹر، مالک : صابر دت

• قومیت : ہندوستانی • پتہ "پرچھائیاں" اے۔ بی۔ نائیر روڈ، جوہو چرچ، بمبئی ۴۹ ۴۰۰۰

میں صابر دت مالک "فن اور شخصیت" اس بات کا اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم و اطلاع کے مطابق درست و صحیح ہیں۔

شرح دستخط
(صابر دت) پبلشر

(ایڈیٹر، پرنٹر، مالک صابر دت نے ماڈرن آرٹ ملٹی کلر آفسیٹ پریس، ایم ۱۸ اشنکر بلڈنگ، مستان ٹینک روڈ ناگپاڑہ بمبئی ۸ میں چھپوا کر "پرچھائیاں" اے۔ بی۔ نائیر روڈ، جوہو چرچ بمبئی نمبر ۴۹ سے شائع کیا۔

قطعہ نمبر

کی اشاعت پر

نیک خواہشات کے ساتھ

سمیع خطیب

صنعت کار، بمبئی

قطعہ نمبر کیلئے

نیک خواہشات کیساتھ

غضنفر علی خان

صنعت کار، بمبئی

نیک خواہشات اُس شخص کیلئے

جو بیک وقت شاعر، صحافی اور خادمِ اُردو ہے۔

"فن اور شخصیت" کا تازہ شمارہ

قطعہ نمبر

یقیناً اُردو کی ادبی صحافت میں ایک سنگِ میل ثابت ہوگا۔

قتیل راجستھانی

مدیر "بزمِ فکر و فن" بمبئی

اِس اُردو کُش دَور میں

ایک مجاہدِ اردو

صابر دت

کے لئے

اپنی نیک تمناؤں کے ساتھ ایک مدّاحِ اُردو

اُسے سلام پیش کرتا ہے

منجانب

ایک خیر خواہِ اُردو

"کاش اُردو میں بھی کوئی ایسی گینز بک آف ریکارڈز ہوتی جس میں اُردو کے









